دانشِ عصر

احمد جاوید

گفتگو: خرم سہیل

گذشتہ دنوں ہمارے عہد کے ممتاز ترین دانشور، شاعر، صوفی اور 'دانش۔پی۔کے' کے سرپرست اعلی جناب احمد جاوید صاحب سے، خرم سہیل نے دانش کے لئے خصوصی گفتگو کی۔ یہ مکالمہ پانچ حصوں میں شایع کیا جارہا ہے۔ اس طویل مصاحبہ میں جاوید صاحب نے بہت سے موضوعات پہ پہلی بار گفتگو کی۔ جن میں اردو ناول، فکشن، منٹو کا فن، فلم، ڈرامہ، سینما، میڈیا کا سراب، گلوبلائزیشن، سماجیات کے بدلتے پہلوؤں سے لے کر نظام تعلیم، دائیں بائیں کی تقسیم اور عوام، اقبال احمد، سلیم احمد، شاعری، میر اور غالب تک شامل ہیں۔

سوال: عہد حاضر میں ہونے والی ناول نگاری کے تناظر میں بتائیے کہ آپ نے کن ناولوں کا مطالعہ کیا اور ان میں سے کون سے پسند بھی آئے؟

جواب: اگر آپ اردو میں لکھے گئے ناولوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو میرا اندازہ ہے کہ جن ناولوں کو کسی بھی حلقے نے، لائقِ اعتبار نقادوں میں سے کسی نے اہم ناول قرار دیا ہے، میں نے شاید ان میں سے اکثر پڑھ رکھے ہیں۔ ویسے جو ناول آخر میں پڑھا ہے، وہ مرزا اطہر بیگ صاحب کا "غلام باغ" ہے۔ یہ کئی برس پہلے چھپا تھا لیکن میرے مطالعے میں چند ماہ پہلے ہی آیا ہے۔ یہ یقیناً اہم ناول ہے، بھی اچھا ہے تاہم اس میں دو کمزوریاں ہیں۔ پہلی theme اتنی اچھی نہیں ہے، اور دوسری کمزوری یہ کہ نثر خاصی کمزور ہے۔ خیر، یہ تو اب thematic structuring تو یہ کہ تک کا پڑھا ہوا آخری ناول تھا، اگر آپ اجازت دیں تو میں اردو ناول کی پوری روایت کے حوالے سے اپنے تاثرات عرض کروں۔ یہ روایت اتنی مختصر سی ہے کہ اسے عہدِ حاضر ہی میں سمجھیں۔ کئی ناول دیکھے جو ایک یا ایک سے زائد وجوہات سے اچھے لگے، اہم محسوس ہوئے۔ جیسے مشہور اور مقبولِ عام ناولوں کے علاوہ فاروق خالد کا "سیاہ آئینے"، انور سن رائے کا "چیخ" وغیرہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈپٹی نذیر احمد کا "ابن الوقت" اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" آج بھی مقبول ہے یا نہیں۔ اس لیے ان کا نام لے کر کہہ رہا ہوں کہ یہ بہت زبردست چیزیں ہیں خصوصاً "فسانۂ آزاد" کا تو ہماری روایت میں جواب ہی نہیں لایا جا سکتا۔ سرشار جیسا زرخیز تخیل اور زبان پر ان کی طرح کی قدرت اور ان کا سا اسلوب شاید اردو میں کہیں نہ ملے۔ ڈپٹی صاحب بھی ظاہر ہے کہ زبان اور اسلوب میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن بے نظیر زباں دانی کے باوجود ان کا اسلوب کسی پیچیدہ تخیل اور تجربے کو بیان نہیں کر سکتا۔ کسی تجربے کی واقعیت کو تو ڈپٹی صاحب ایسے بیان کرتے ہیں کہ شاید ہی کوئی کر سکے، لیکن اس تجربے کو ذرا پیچیدگی کے ساتھ اور ذرا گہرائی میں جا کر تشکیل دینے والے عناصر اول تو ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتے اور اگر کہیں تجربے کی واقعیتی ساخت کے باوجود اُس میں قدرے پیچیدگی وغیرہ کا پہلو پیدا بھی ہوتا ہے تو ڈپٹی صاحب کے مجلسی اور مدرّسی اسلوب کی وجہ سے وہ خود بخود پیدا ہونے والا پہلو دب جاتا ہے۔ شاید اُس زمانے کے آدمی کا مزاج ہی ایسا تھا کہ چیزوں کے ساتھ تعلق کے زاویے طے شدہ تھے اور انفرادی طرزِ احساس وغیرہ کی اُسے ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ لیکن کچھ بھی ہو، ڈپٹی نذیر احمد کا "ابن الوقت" اردو ناول کے بڑے کرداروں میں سے ہے۔ اور ویسے بھی ڈپٹی صاحب کی کردا ر نگاری خاصے کی چیز ہے۔

احمد جاوید اور خرم سہیل

معاشرتی طبقہ بندی میں صور ت پکڑنے والی نفسیات اپنے گنے چنے مظاہر ہی رکھتی ہے۔ طبقوں میں راضی خوشی تقسیم سماج کے افراد میں نفسیاتی گنجلک بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہےاور تنوع بھی کم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان

کے یہاں شخصیت اور کردار کی بس کچھ ہی قسمیں ہوتی ہیں جن میں فرق کی بنیاد یا تو مذہبی اور اخلاقی ہوتی ہے یا نسلی اور معاشی وغیرہ۔ طبقاتی امتیاز کے داخلی اسباب اور تاریخی محرکات کی حیثیت اُن معاشروں میں بالکل ضمنی ہوتی ہے۔ تو یہ ایک طرح سے ڈپٹی نذیر احمد کی مجبوری بھی تھی۔ وہ اپنے کرداروں میں unnoticed اور ثانوی اور اور ان کرداروں کے ماحو ل میں نفسیاتی اور تاریخی کشاکش کو دیکھ ہی نہ سکتے تھے تو بیان کہاں سے کرتے۔ لیکن کی کمزوری بھی اُسے متاثر نہیں content بھائی یہ سب کہہ تو دیا لیکن ڈپٹی نذیر احمد کی نثر اتنی مضبوط ہے کہ کر سکتی۔ باقی اُن کی مقصدیت اور اصلاح پسندی پر بھی بات کرنی چاہیے مگراس کا یہ موقع نہیں، پھر کبھی سہی۔ کے طور پر۔ ان کا ناول anti-thesis ڈپٹی صاحب پر باتیں کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی یاد آرہے تھے، ان باتوں کے "کئی چاند تھے سرِ آسماں" اپنی تہذیب کے ایک طرح سے سیکولر در و بست اور جمالیاتی اصول و مظاہر کا اچھا بیان ہے۔ مجھے اس کے بارے میں بھی نہیں پتا کہ یہ مقبول ہے کہ نہیں۔یہ بہت منفرد اور اہم ناول ہےجس میں ایک محدود ماحول میں تاریخ اور تہذیب کے تصادم کا ایک خاص گوشہ اور ٹکڑا کسی قدر کمزور تخیل کے باوجودعمدگی سے بیان ہوا ہے۔ مگر تخیل کمزور ہے، اس لیے منظر نگاری بھی کمزور ہے۔ زبان درست تو بہت ہے لیکن اس میں تخلیقی پن کم ہے۔ تخلیقی پن سے میری مراد شاعرانہ پن یا اسلوب کی رنگینی اور سج دھج نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ کا اہتمام اتنا زیادہ ہوگیا ہےکہ اکثر جگہ پر لفظ محض مفہوم بن کر رہ گیا accuracy روزمرہ درجے کی صحت اور ہےاور ذرا گہرائی کے ساتھ محسوس نہیں ہوپاتا۔ یوں ہی ایک گمان سا ہے، یا خواہش کہہ لیجیے کہ یہ ناول اگر انتظار حسین یا نیر مسعود لکھتے تو اس میں یہ کمزوریاں بھی نہ رہتیں اور کچھ خوبیوں کا اضافہ بھی ہوجاتا۔

شاعرانہ زبان چیزوں کے ساتھ تعلق کی بعض علمی ضرورتیں اور نفسیاتی حاجتیں پوری نہیں کرتی لیکن ناول، یا فکشن زبان کو ذہن سے زیادہ زندگی سے جوڑتا ہے جسکی وجہ سے ناول کی زبان میں ایک متحرك پھیلاؤ ہوتا ہے جو شاعری کی بعض اصناف میں ہے مگر اس میں آرائشی پہلو اتنا غالب ہوتا ہے کہ وہ پھیلاو زندگی کے جیتے جاگتے مظاہر کے ساتھ علاقہ نہیں پیدا کر پاتا۔ ہاں اگر اجازت ہو تو خرم صاحب جو آپ نے نہیں پوچھا یا آگے چل کر پوچھیں گے، اس پر بھی کچھ ٹوٹی پھوٹی باتیں اور اُس تہذیب کے mechanicsکر دوں۔ کسی تہذیب، روایت، تاریخ یا ذرا نیچے اتر کر کسی سماج کے اقدار اور مظاہر، کو گویا تجربے اور مشاہدے کی حد تک سمجھنے جاننے کے لیے شاعری اور فکشن کا مطالعہ ضروری microcosm ، ڈرامے اور ناول کا۔ انھیں نہ پڑھنے کا نقصان ایسا ہے جس کی تلافی سماجی علوم میں Epics ہے۔ خاص طور پر مہارت پیدا کر کے بھی نہیں ہوسکتی۔ آپ افلاطون کو گھول کر پی جائیں تو بھی یونانی تہذیب کو اس وقت تک نہیں نہ بنیں۔ ناول ذہن qualified reader سمجھ سکتے جب تک ہومر کو نہ پڑھیں، سوفوکلیس وغیرہ کو نہ پڑھیں، ان کے اور احساس کی جن سطحوں پرزندگی کا تعارف کرواتا ہے اور تاریخ کی چھپی ہوئی واقعی یا غیر واقعی پرتوں کو کھولتا ہے اور تجربے پر عائد بندشوں کو ڈھیلا کر کے تجربے میں توسیع کے ان امکانات کو ابھارتا ہے جو عالم فاضل دماغ تخیل میں پیوندکاری کا عمل کرتا ہے ایک ناولسٹ۔ realistic کےلیے غیر مانوس ہوتے ہیں۔ تاریخ اور ایک طرح سے لیکن ظاہر ہے کہ ناول نگاری کی ایک خاص روایت میں کام کرنے والا ناولسٹ۔ اسی طرح تہذیب جو انسان اور تاریخ کے درمیان تعلق کے نتائج کا مجموعہ ہوتی ہے، ناول کا ایك فطری مضمون ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ناول کا بطورِ ہیئت تجزیہ کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ صنف تہذیبی اظہار سے بہت مناسبت رکھتی ہے۔ ناول نویسی کو تہذیب نگاری کاعنوان دینا بھی غلط نہ ہو گا۔ جیسے ان لوگوں کی بات درست معلوم ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ناول پڑھے بغیر تہذیب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی مشکل یہ ہے کہ ادب پڑھنے والا، شاعری پڑھنے والا، ناول پڑھنے والا تہذیب شناسی وغیرہ کا مقصد لے کر کتاب نہیں کھولتا۔ اس کے لیے یہ بات زیادہ متاثر کن نہیں ہے کہ ڈکنز کو پڑھے بغیر انگریزی معاشرت کو نہیں سمجھا جا سکتا یا استاں دال کو نہ پڑھا جائے تو اس زمانے کی فرنچ سوسائٹی کا پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے وہ ادبیات کا قاری ہے، کوئی ریسرچر تھوڑا ہی ہے۔

ناول کے بارے میں یہ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ انسان، تہذیب، تاریخ، زبان وغیرہ کی ایسی معرفت جس کے لیے ذہن چھوٹا ظرف ہے، ناول سے حاصل ہو جاتی ہے۔ ادب کا مطالعہ، محمد حسین آزاد کی اصطلاح میں، آہ یا واہ پر تمام ہو جاتا ہے۔ ہاں، اس آہ یا واہ کے اسباب و محرکات ہر متن میں مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں نقاد داخل ہوتا ہے جو ان اسباب و محرکات کی تشخیص کرتا ہے اور ان کی درجہ بندی کرتا ہے۔ تنقید گویا ایك متوازی عمل ہے جو تخلیقی روایت کو ایك بالاتر مجموعی روایت سے ہم آہنگ رکھتا ہے۔ یعنی تخلیقی تخیل کو اسی شعور کا فعل بنا کر دکھاناجس سے نظریات وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ آج کل لٹریری تھیوری کا

جو چلن دکھائی دیتا ہے، اس کے پیچھے یہی اصول کار فرما ہے۔ تخلیقی عمل ہو یا تحقیقی عمل، دونوں کی لگام ایک ہی ہاتھ میں ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو شاید یہ بات کم از کم پہلی نظر میں غلط نہ لگے کہ ناول میں تخلیق اور تحقیق کا ہم اصل ہونا زیادہ وضاحت سے ظاہر ہے۔ اسی لیے جن ناولوں کو کم و بیش اتفاقِ رائے کے ساتھ بڑا مانا جاتا ہے وہ کوئی نہ کوئی ورلڈ ویو رکھتے ہیں۔ یہ ورلڈ ویو تخلیقی اور جمالیاتی مقاصد تک پہنچنے کے مختلف مراحل میں اپنی تصدیقی اور اطلاقی ضرورتیں بھی پوری کرتا ہے اور مفہوم بننے کی شرطیں نبھاتےہوئے فہم کی بعض معمول کی عادتوں سے آزادی پیدا کر کے اس ورلڈ ویو کی ایسی عملی اور داخلی اسٹرکچرنگ کرتا ہے جہاں چیزیں ایک نئی معنویت کی حامل بن جاتی ہیں۔ اگر اپنی سہولت کے لیے حقیقت کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو میرے مطالعے کی حد تک کوئی بڑا یا اہم ناول ایسا نہیں ہے جس نے مسلمہ حقیقت، مثلاً حقیقت وجود تک رسائی کے نئے راستے اور اسے دیکھنے کے نئے زاویے اور اسے سمجھنے جاننے کے نئے احوال وغیرہ نہ فراہم کیے ہوں۔ اردو میں بھی جو چند ناول کوئی ورلڈ ویو رکھتے ہیں اور اس کا ایک تخلیقی بیان بھی رکھتے ہیں، وہی بڑے ناول یا اہم ناول، جو بھی کہہ لیں، مانے گئے ہیں۔ مثلاً آگ کا دریا، اداس نسلیں، علی پور کا ایلی، گردش رنگ چمن وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے ناول کے بارے میں یہ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ انسان، تہذیب، تاریخ، زبان وغیرہ کی ایسی معرفت جس کے لیے ذہن چھوٹا ظرف ہے، ناول سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ علم اگر غلط ثابت ہو جائے تو ذہن اور چیزوں کے تعلق میں اس غلط علم کا جو کردار ہوتا ہے، وہ بالکل ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم ناول کی بات کر رہے ہیں اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ایک ناول نگار ذہن اور شے کے تعلق کے متروکات کو بھی استعمال میں لے آتا ہے اور اس طرح چیزوں کے ساتھ تعلق کی وہ سطحیں بھی بیدار رہتی ہیں جنھیں عام طور سے علم کا موضوع نہیں بنایا جاتا اور اگر کہیں بنایا بھی جاتا ہے تو ذہن اس میں اتنی ملاوٹ کر دیتا ہے کہ انہیں اعتماد کے ساتھ محسوس کرنا ممکن نہیں رہ جاتا۔ اسی پہلو سے ہم ناول کو ایسا متن کہہ سکتے ہیں جو تاریخ کے مختلف متون میں مرکزیت کے ساتھ اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ جیسے ایزرا پاؤنڈ نے ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کو ایڈٹ کر کے بیسویں صدی کی سب سے بڑی نظم بنا دکھایا، ایسی ہی ایڈیٹنگ ناول نگار تاریخ کے ویسٹ لینڈ کی کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ تو خیر، یہ بات یقینی ہے کہ اگر کسی تہذیب میں ناول نگاری کی روایت مضبوط ہو اور مسلسل حالت میں ہو، تو اس تہذیب کو اس میں لکھے گئے ناولوں کی مدد سے جتنا سمجھا جاسکتا ہے، اتنا کسی اور علمی ذریعے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ عقائد، بنیادی تصورات، زبان، معیشت، معاشرت، رسم و رواج، طبقاتی نفسیات وغیرہ کا جیسا مشاہدہ بلکہ تجربہ ناول پڑھ کے ہو سکتا ہے وہ کسی اور ڈسپلن میں لکھی گئی کتاب پڑھ کے ممکن نہیں ہے۔ لیکن بھائی، ظاہر ہے کہ تمام ناول ایک سے نہیں ہو سکتے، یعنی بہت سے ناول ہوں گے جن میں تہذیب تاریخ وغیرہ کا کوئی تکلف نہیں پالا گیا ہوگا۔

"دشتِ سوس" کے ساتھ یہ ہوا کہ حلاج کا جہنم گویا انگیٹھی میں جھونک دیا گیا۔ حلاج کو بہت آسانی سے ناول کی روایت کے سب سے زندہ اور مکمل کرداروں کی صف میں لایا جا سکتا تھا لیکن بہر صورت یہ کام عقیدت مند جذباتی تذکرہ نویس بن کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تو اب تک جو عرض کیا ہے اس کی بے لچک تعمیم نہ کی جائے تو بہتر ہو گا۔ تاہم ایک چیز ایسی ہے جس کے بغیر ناول، ناول نہیں کہلا سکتا چاہے وہ کسی بھی روایت میں لکھا گیا ہو۔ اور وہ ہے کردار اور زبان! نفس اور لفظ کی باریکیاں دسترس میں نہ ہوں تو آدمی ڈائجسٹوں کے لیے کوئی سیریز تو لکھ سکتا ہے مگر ناول اور فکشن نہیں۔ ایک اچھا ناول نگار آدمی کے ہر ٹائپ کو اعلی درجے کی نفسیاتی بصیرت کا موضوع بننے کے لائق بنا دیتا ہے، اور اسی طرح بولی جانے والی زبان کے اکہرے پن اور یکسانی کو اس حد تک ختم کر دیتا ہے کہ وہ خیالات اور احساسات بھی آمادۂ اظہار ہو جاتے ہیں جو زبان کی روزمرہ تنگی اور گراوٹ سے اکتا کر، مایوس ہو کر چپ سادھ چکے تھے۔ ناول شاعری کے مقابلے میں بھی زبان کی عمومی طاقت میں زیادہ اضافہ کرتا ہے اور اس میں پھیلنے کی حرکت پیدا کرتا ہے، جیسا کہ شاعری اس میں بلندی کے امکانات کو بروے کار لاتی رہتی ہے۔ ویسے ہی ایک بات آگئی ہے، کہہ دینے میں شاید کوئی حرج نہ ہو۔ وہ بات یہ ہے کہ شاعرانہ زبان چیزوں کے ساتھ تعلق کی بعض علمی ضرورتیں اور نفسیاتی حاجتیں پوری نہیں کرتی لیکن ناول، یا یوں کہہ لیں کہ فکشن زبان کو ذہن سے زیادہ زندگی سے جوڑتا ہے جس کی وجہ سے ناول کی زبان میں ایک متحرک پھیلاؤ ہوتا ہے جو شاعری کی بعض اصناف میں ہے مگر اس میں آرائشی پہلو اتنا غالب ہوتا ہے کہ وہ پھیلاؤ زندگی کے جیتے جاگتے مظاہر کے ساتھ علاقہ نہیں پیدا کر پاتا۔ لیکن بہرحال یہ کوئی موازنہ نہیں ہو رہا، شاعری کا اپنا ایک نظامِ ادراک و اظہار ہے اور ناول کا اپنا۔ شاعر ناولسٹ بن جائے تو شاعری خراب ہو جائے گی اور ناول نگار شاعر بننے کی کوشش کرے تو ناول غارت ہو جائے گا۔ کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ ناول زبان کی تفصیل کو تعمیرِ نو کے عمل میں رکھتا ہے جبکہ شاعری اجمال اور اصول کو بھی تازہ اور پرمعانی رکھتی ہے۔ مجھے تو یہی محسوس

ہوتا ہے کہ شاعری میں معانی جیسے علامت کے اجزا ہیں۔ اس وجہ سے ہر معنی خود سے بلند ہوتا رہتا ہے اور قاری کو اس عروجِ مسلسل کا خیال اور احساس وغیرہ کے حوالے سے ساتھ دینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ناول میں الفاظ جیسے کسی واقعے کے کردار ہیں، ایسے کردار جنھیں اسکرپٹ سے تجاوز کرتے رہنے کی ذمہ داری بھی دی گئی ہے۔ آپ خود تجربہ کر کے دیکھ لیں، دوستووسکی کا کوئی ناول کھول لیں یا کافکا کی کوئی کتاب لے لیں یا کسی اور کی۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ بظاہر سادہ سے احساسات در حقیقت بہت پیچ در پیچ ہیں۔ کم از کم دوستووسکی کو پڑھتے وقت مجھے تو ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہےکہ احساسات اور ان کے محسوسات کی جبری نسبت ٹوٹ گئی ہے۔ احساسات میں قلبِ ماہیت سے ملتا جلتا یہ عمل شاعری پڑھتے وقت شاید کبھی محسوس نہ ہو۔

شاعری میں معانی جیسے علامت کے اجزا ہیں۔ اس وجہ سے ہر معنی خود سے بلند ہوتا رہتا ہے اور قاری کو اس عروجِ مسلسل کا خیال اور احساس وغیرہ کے حوالے سے ساتھ دینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ناول میں الفاظ جیسے کسی واقعے کے کردار ہیں، ایسے کردار جنھیں اسکرپٹ سے تجاوز کرتے رہنے کی ذمہ داری بھی دی گئی ہے۔

ایك ذاتی سی بات عرض کرتا ہوں۔ ہم لوگوں کی زندگی ایسی ہو گئی ہے کہ ذہن و دل کا بہت ہی چھوٹا سا حصہ بیدار رہتا ہے۔ مطلب، ذہن کی تزئین کرنے والے تخیل کا کوئی مصرف ہی نہیں رہ گیا ہے، چیزوں اور لوگوں سے تعلق کا ایسا ڈھب بن چکا ہے کہ دل کو اپنے نسبتاً گہرے پیشنز کو سلائے رکھنا پڑتا ہے۔ سب خیالات و احساسات دیہاڑی دار مزدوروں کی طرح ہو کر رہ گئے ہیں، کام مل جاتا ہے تو روکھی سوکھی کھا لیتے ہیں اور نہیں ملتا تو اسی روکھی سوکھی کے تصور میں سو جاتے ہیں۔ قلب و ذہن کا یہ افلاس جب بہت تنگ کرنے لگتا ہے تو میں عموماً رومی کے دیوان اور دوستووسکی، کافکا اور سیموئل بیکٹ سے مدد لیتا ہوں۔ یہ چاروں ہمیشہ بیہوشی، بے حسی اور پست ہمتی کا کوئی نہ کوئی توڑ ضرور فراہم کر دیتے ہیں۔ آپ تو سمجھتے ہی ہیں کہ آج کل بار بار دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم آدمی رہ بھی گئے ہیں یا نہیں؟ آدمیت کی تجدید ہی میرے خیال میں اصل کام ہے جس میں شاعری اور فکشن سے بہت مدد ملتی ہے۔ احساس، جذبے اور تخیل پر لگا ہوا زنگ نظریات وغیرہ کی کھرپی سے صاف نہیں ہو سکتا، اس کے لیے وہ ذوقِ حیات چاہیے، وہ جذبۂ وجود چاہیے جو آدمی کو ہونے کی مستی سے چھکا ہوا رکھتی ہے۔ خالص، کھری اور پور پور میں سرایت کیے ہوئے دھار دار مستی سے! کم از کم ہمارے یہاں زندگی جسے جدید زندگی کہہ کر فخر کیا جاتا ہے، کلوروفارم بن کر رہ گئی ہے۔ وجود کا نظام چلانے والے تمام احوال اور ذہن کا گھر روشن رکھنے والے تمام آدرش سن ہو کر رہ گئے ہیں۔

کوئی بڑی تباہی آتی ہے تو بڑے درخت اور بڑے جانور وغیرہ فنا ہو جاتے ہیں، بس چھوٹی چھوٹی زہریلی جھاڑیاں اور حشرات الارض ہی بچ جاتے ہیں، ہمارا یہ حال ہے۔ چھوٹے چھوٹے احساسات، معمولی معمولی خیالات اور سانپوں کی پھنکار جیسے جذبات ہی اب ہماری کل پونجی ہے۔ تو بھائی کہاں کا احساساتی تنوع اور تخیل کی رنگا رنگی! سب کو دیمک لگ چکی ہے۔ کبھی کبھی خواہش ہوتی ہے ہرا بھرا ہونے کی، تو پھر دیوانِ شمس، وار اینڈ پیس وغیرہ کھول لیتا ہوں مگر مصیبت یہ ہے کہ کھولی جانے والی کتاب بند بھی کرنی پڑتی ہے۔

سوال: پاکستانی ادب میں آپ کا کوئی پسندیدہ ناول نگار جس سے متاثر ہوئے ہوں، یا جس کو آپ بڑا ادیب سمجھتے ہوں؟ بڑے کی شرط نہ لگائی جائے تو کئی ناول نگار ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں۔ جیسے عبداللہ حسین، فاروق خالد، ممتاز مفتی، انتظار حسین، جمیلہ ہاشمی اور محمد خالد اختر جن کا "چاکیواڑا میں وصال" بڑی زبردست اور منفرد چیز ہے۔ آج کل کے ناول نگاروں میں مرزا اطہر بیگ ہیں، انور سن رائے ہیں، ظفر سید ہیں، اور بھی دو تین نام ہیں جو ابھی یاد نہیں آرہے۔ یہاں میں ایك نام اور لوں گا مگر تحسین کے بجائے شکات لیے: محمد سلیم الرحمن جو عہد حاضر کے سب سے بڑے نظم گو تو ہیں ہی، سب بڑے ناولسٹ بھی ہوتے لیکن ان کی بے توجہی نے اردو فکشن کا بڑا نقصان کر دیا۔ اور ہاں، عزیز احمد کا نام لینا تو بھول ہی گیا۔ انھوں نے بھی اردو کو چند اچھے ناول دیے ہیں۔۔۔۔۔ "گریز، شبنم، ایسی پستی ایسی بلندی"۔ ان کےدو ناولٹ بھی کمال کے ہیں، "خدنگِ جستہ" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں"۔ واہ۔

ہم لوگوں کی زندگی ایسی ہو گئی ہے کہ ذہن و دل کا بہت ہی چھوٹا سا حصہ بیدار رہتا ہے۔ مطلب، ذہن کی تزئین کرنے والے تخیل کا کوئی مصرف ہی نہیں رہ گیا ہے، چیزوں اور لوگوں سے تعلق کا ایسا ڈھب بن چکا ہے کہ دل کو اپنے نسبتاً گہرے

پیشنز کو سلائے رکھنا پڑتا ہے۔ سب خیالات و احساسات دیہاڑی دار مزدوروں کی طرح ہو کر رہ گئے ہیں، کام مل جاتا ہے تو روکھی سوکھی کھا لیتے ہیں اور نہیں ملتا تو اسی روکھی سوکھی کے تصور میں سو جاتے ہیں۔

سوال: آپ کی نظر سے فہمیدہ ریاض کا ناول "قلعہ خاموشی" گزرا؟ آپ جو گفتگو اور اصول بتا رہے ہیں، وہ اسی کے عین مطابق لکھا ہوا ہے۔
جواب: میں نے نہیں دیکھا۔ اور یہ اعتراف جرم ہے، اظہارِ بے نیاز ی نہیں۔ فہمیدہ ریاض نظم و نثر دونوں میں اچھی تھیں۔ ان کا یہ ناول ان شاء اللہ پہلی ہی فرصت میں دیکھوں گا۔

سوال: اردو میں بڑا ناول آپ کسے سمجھتے ہیں؟
جواب: بدتمیزی یا اشتعال انگیزی نہ سمجھا جائےتو مجھے، یقینا میری ہی بدذوقی ہوگی، کوئی اردو ناول اس بڑائی کا حامل نظر نہیں آتا جو مثال کے طور پر دوستووسکی، کافکا، پروست، جوائس وغیرہ کے ہاں پوری قطعیت سے پائی جاتی ہے۔ دو چار ناولوں میں بڑائی کی سکت تو البتہ محسوس ہوتی ہے مگر بعض تہذیبی، نفسیاتی، لسانیاتی اسباب سے وہ سکت گھٹ کر رہ گئی۔ جیسے "آگ کا دریا" ہے یا "غلام باغ" ہے۔ ان دونوں ناولوں کو بڑے ناول بنانے کا موقع کسی نہ کسی بہت بنیادی کمزوری کی وجہ سے مس کر دیا گیا۔ "دشت ِ سوس" کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ حلاج کا جہنم گویا انگیٹھی میں جھونک دیا گیا۔ حلاج کو بہت آسانی سے ناول کی روایت کے سب سے زندہ اور مکمل کرداروں کی صف میں لایا جا سکتا تھا لیکن بہر صورت یہ کام عقیدت مند جذباتی تذکرہ نویس بن کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو وہی کر سکتا تھا جو ققنس اور سمندر بن سکتا ہو۔ بھائی، یہ کراچی والا پس ماندہ اور آلودہ سمندر نہیں بلکہ آگ میں زندگی کرنے والا وجود ہے جسے بے درد لوگ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کیڑا کہہ دیتے ہیں۔ عرفی کا مشہور شعر ہے، آپ کو بھی یاد ہوگا:
ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

قرۃ العین حیدر کی نثر اچھی ہے، مطالعہ بھی وسیع لگتا ہے، تاریخ اور اس کے جبر کا شعور بھی ہے لیکن ان کے ہاں تکلف بہت ہے، آرائش بہت ہے، اس لیے واقعہ بھی نک سک سے درست اور سوچا ہوا سا لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تصویر اچھی بنا لیتی ہیں، خیال کو صفائی کے ساتھ اور سجا بنا کر پیش کر دیتی ہیں مگر یہ سب خوبیاں اکثر خاصی کم ہےجو تخیل اور تجربے کی vitality جگہوں پر کاغذ کے پھولوں کی طرح ہیں، ان میں وہ زندگی، تپش اور دوئی کو ختم کر دیتی ہے۔

سوال: مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں کو کس طرح دیکھتے ہیں، بالخصوص اُن کا ناول "بہاؤ" جو اسلوب اور بیانیے کے حوالے سے اپنی خاص شہرت رکھتا ہے؟
جواب: ارے جناب میری کیا رائے وائے، البتہ آپ نے کچھ بھولے ہوئے دن یاد دلا دیے، مبارک دن۔ تارڑ صاحب اور میں نے سعودی عرب کا ایک سفر ساتھ کیا تھا۔ کچھ دن ریاض میں گزارے پھر مدینے چلے گئے۔ میں الگ ہوٹل میں ٹھہرا اور وہ اپنی بیگم کے ساتھ دوسرے ہوٹل میں۔ وہاں اچانک میری کمر میں شدید تکلیف ہوئی جس نے مجھے بستر پر ڈال دیا۔ تارڑ صاحب کو اس ناگہانی اُفتاد کی خبر نہ ہوسکی کیونکہ نہ وہ جانتے تھے کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور نہ ہی مجھے پتا تھاکہ وہ کہاں ہیں۔ ایک آدھ دن بعد مکے بھی ہم لوگوں کو ساتھ ہی جانا تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے ڈھونڈتے رہے ہوں گے مگر میں حرم ہی جانے سے معذور تھا تو انھیں کہاں سے ملتا۔ بہرحال، وہ پروگرام کے مطابق عمرہ کر کے غالباً آگے لندن چلے گئے اور میں ادھر چھ سات دن تک مدینہ ٔ منورہ ہی میں صاحب فراش رہا۔ اللہ جانے کیسے کیسے خیال ان کے دل میں آئے ہوں گے۔ لاہور واپس پہنچ کر میں نے رابطہ تو کیا مگر بات نہ ہوسکی۔ شاید ان دنوں وہ لندن میں تھے۔ بہرحال اب ملاقات ہوئی تو عرض کروں گا کہ سرکار مجبوری تھی، بے پروائی نہیں۔

سوال: وہ ناول جو بہت زیادہ مقبول ہے، اس سے مراد زیادہ فروخت ہونا اور پڑھا جانا ہے اور اب ڈرامے کی شکل میں دیکھا بھی جانا ہے۔یہ ڈائجسٹ لکھنے والے ناول نگار ہیں جس میں خواتین و مرد دونوں طرح کے لکھاری شامل ہیں۔ آپ کی نظر

میں مظلوم عورت اور سطحی جذبات بالخصوص مذہب کے حوالے سے، کیا اس طرح کی ناول نگاری کو ادب کہا جا سکتا ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟
نچلے درجے کی جذباتیت اور سنسنی خیزی ہمارا مزاج ہے۔ جو لوگ اپنے نظریات کی ذہنی اور اخلاقی تشکیل نہیں کرسکتے وہ انھیں جذبات میں بدل دیتے ہیں۔ زندگی میں اصول اور اقداربننے کا تقاضا رکھنے والے تمام تصورات ہمارے یہاں جذبات کے تنور اور خوابوں کے فریزر میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں مذہبی غیر مذہبی کی کوئی تفریق نہیں ہے، یہ ہمارا اجتماعی مزاج ہے۔
جواب: ظاہرہے یہ سب کچھ ادب تو نہیں ہےمگر کسی نہ کسی درجے میں تخلیقی سرگرمی ضرور ہے۔ زبان کی تعمیر میں بھی ان کا ایک کردار بہرحال ہےجو چاہے انجینئر کی سطح کا نہ ہو، مزدوروں کی سطح کا بہر حال ہے۔ یہ بات ان ناول نما چیزوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں جو ڈائجسٹوں کے لیے لکھی جا رہی ہیں۔ انھیں ناول مجبورا کہنا پڑ رہا ہے ورنہ ناول اصل میں ایک ریسرچ پروجیکٹ بھی ہوتا ہے اور ناول نگار میں ایک باریک بیں محقق بھی فعال ہوتا ہے۔ وہ تاریخ اور آدمی کے درمیان تعلق کی پیچیدہ حرکیات کا معروضی ادراک بھی رکھتا ہے۔ باقی رہی نچلے درجے کی جذباتیت اور سنسنی خیزی کی بات، تو یہ ہمارا مزاج ہے۔ جو لوگ اپنے نظریات کی ذہنی اور اخلاقی تشکیل نہیں کرسکتے وہ انھیں جذبات میں بدل دیتے ہیں۔ یہ جذبات کبھی چنگیز خان کے سے ہوتے ہیں اور کبھی شیخ چلی کے سے۔ غرض زندگی میں اصول اور اقدار بننے کا تقاضا رکھنے والے تمام تصورات ہمارے یہاں جذبات کے تنور اور خوابوں کے فریزر میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں مذہبی غیر مذہبی کی کوئی خاص تفریق نہیں ہے، یہ ہمارا اجتماعی مزاج ہے۔ اس کے علاوہ تماش بینی اور دکھاوا بھی یوں لگتا ہے کہ ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے۔ یہی سب رویے ان ناولوں سے بھی ظاہر ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔ لیکن چلیں ایک رونق تو لگی ہوئی ہےجو ہمیں احساس دلاتی ہے کہ زندگی سے لاتعلقی اور محرومی کے باوجود ہم مسخروں کی طرح سہی، جی تو رہے ہیں۔ زندگی چاہے شیخ چلی کی ہو، قابلِ قدر ہے۔ رہی بات سطحی جذبات اور جارحانہ جذباتیت کی، تو بھائی جذبات آئینہ ہوتے ہیں وجودی معیار کا۔ وجود ہی اتھلا اور سطحی ہو تو جذباتی گہرائی اور ٹھہراؤ کہاں سے آئے۔ اور وجودی طمانیت اور شانتی ہوگی تبھی تو ہرے بھرے جذبات پیدا ہوں گے۔ لیکن چلو اس للکارتی بنکارتی جذباتیت نے ہمیں مجموعی طور پر اپنی کم تری اور مہملیت کے جان لیوا احساس سے کم ازکم آج تو بچا رکھا ہے، کل کی کل دیکھی جائے گی۔

سوال: سینما میرا موضوع ہے اور میں اس پر سنجیدہ تحقیق و تصنیف میں مشغول رہتا ہوں، اسی روشنی میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ مغرب میں ناول پڑھنے والے قارئین کو سینما کی اسکرین مہیا کر دی گئی، وہاں ہر اچھے ناول پر فلم بن جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مغرب میں اب بھی کتاب بہت فروخت ہوتی ہے تو کیا قاری کو ناظر بنا دینا مفید ہے؟ اور بذات خود یہ عمل کتنا کارآمد ہے؟
جواب: اچھا، میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کا خاص موضوع سینما ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ بڑے قیمتی آدمی ہیں۔ ہمیں دانشور مصنفوں سے زیادہ دانشمند فلم سازوں کی ضرورت ہے۔ تو خیر، 'نظر' کے دو معنی ہیں حالانکہ عزیز میاں قوال نے تو چار بتائے ہیں مگر میری رسائی سرِدست دو تک ہی ہے: نگاہ اور فکر۔ یعنی نظر آنکھ ہی کا فعل نہیں ہے، دل اور دماغ کی پراپرٹی بھی ہے۔ اس لیے ناولوں پر فلمیں بنانے کی روایت بہت کار آمد ہے بشرطیکہ ناول پڑھنے کا چلن کمزور نہ پڑے۔ تخیل بھی دید ہی ہے۔ اگر دید کے اس حال میں آنکھوں کی شمولیت کا بھی راستا نکل آئے تو **میں ایبسرڈ تھیٹر کو پسند کرتا ہوں بلکہ یوں کہہ لیں کہ حسبِ عادت مبالغے کےساتھ پسند کرتا** !کیا کہنے
پر تو دوستوں کے ساتھ The Chairs اور Waiting for Godot **ہوں۔** بیکٹ اور آئنسکو کو تو بار بار پڑھتا رہتا تھا۔
The جنھیں شاگرد کہتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی ہے، کئی نشستیں بھی کر رکھی ہیں۔ جس زمانے میں ہم لوگ پڑھ رہے تھے، ایک صاحب نے اس پر بنایا گیا اسٹیج ڈرامہ دکھایا۔ اس فلم نے کم از کم مجھے تو کئی بہت Chairs ضروری چیزیں سجھا دیں جو صرف پڑھنے سے سمجھ میں نہ آتیں۔ تو بہرحال، اصول کی بات یہ ہے کہ ذہن میں جو ہی تو ہے۔ یہ فہم بھی ہے اور دید بھی۔ تو **ناول پر بنی فلمیں دیکھنا اپنی** re-presentation کچھ ہے وہ چیزوں کی **ہو جاتا ہے، لیکن ناول پڑھنا بہت زیادہ ضروری ہےورنہ تو وہی historicize جگہ مفید ہے کیونکہ اس سے ناول زیادہ بات ہوگی کہ میں نے سمجھنا چھوڑ کر دیکھنے پر قناعت کر لی۔** فلم بینی اگر ناول خوانی کا بدل بن گئی تو یہ صورتحال زوال ہی کی صورتحال ہوگی۔
سوال: آپ فلمیں دیکھتے ہیں؟
جواب: جی نہیں، میں فلمیں نہیں دیکھتا اور اس کوتاہی پر معافی کا خواستگار ہوں۔
سوال: لیکن ہمارے ہاں تو یہ تنزلی مزید تیزی سے آئی، کتاب سے رغبت ختم ہوئی، سمجھنے کی بجائے دیکھنا شروع کر دیا، سوشل میڈیا اور موبائل کی صورت حال آپ کے سامنے ہے، ہم بھی تو اب پھر حالت زوال ہی میں ہیں؟

مجھ کو خود مجھے محسوس کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ اگر میں اس رکاوٹ سے لڑتے ہوئے اپنے احساس و ادراک میں رہنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری شخصیت ماحول کی تائید نہ ہونے کی وجہ سے عجیب طرح کی تڑی مڑی اور introvert قسم کی شخصیت بن کر رہ جاتی ہے۔

جواب: جی ہاں، مگر یہ تنزل گلوبل ہے۔ تاہم ہمارا معاملہ یہ ہے کہ **ہمارے ہاں حالت کمال تو آئی ہی نہیں تھی، بس زوال کے مظاہر ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔** مغرب بھی اس پہلو سے زوال پذیر ہے لیکن ان کے پاس اس زوال کو ایک حد میں رکھنے کی قوت بھی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ موجودہ دور میں، مطلب ٹیکنالوجی کے دور میں، آدمیت نے جہاں بعض پہلوؤں سے ترقی کی ہے وہیں اسے ایک جوہری انحطاط اور بحران سے بھی گزرنا پڑ رہا ہے۔ **ٹیکنالوجی ہمیں اپنے اندر جھانکنے سے روک دیتی ہےاور انفرادیت کی باطنی بنیادوں کو کمزور کرتے کرتے بالآخر ڈھا دیتی ہے۔** فرد کو اپنا ہونا بے جواز لگنے لگتا ہے۔ چیزوں سے تعلق کی احساس انگیز حالتیں اور دھیرے دھیرے تھوڑا تھوڑا کر کے منکشف ہونے والی کہیں دھندلی اور کہیں روشن نسبتیں، اور گہرے سانس کی طرح سینے کو بھر دینے والا ان کا ورجن لمس، یہ سب جیسے سامری جادوگر کی چھڑی کے اشارے سے غائب ہوتا جا رہا ہے۔ ٹیکنالوجی نے آدمی کے موسوی جوہر کو لگتا ہے کہ مار دیا ہے اور مصر کے تائب جادوگروں کی توبہ تڑوا دی ہے۔ اب تو جناب، کلیم اللهی رجعت پسندی ہے، پس ماندگی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت موقع نہیں ہے کہ ٹیکنالوجی کی سب سے بڑی تاثیر یعنی dehumanization پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ ٹیکنالوجی انسان کے تعریفی حدود کو توڑ رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ میرے لیے یہ احساس بہت با معنی، اطمینان بخش، اعتماد افزا اور تسلی دینے والا، ڈھارس بندھانے والا تھا کہ 'میں ہوں'۔ وجود و عدم کی کشاکش میں ثابت قدم یا متزلزل 'میں'! حالات کی ہر اونچ نیچ مجھے میرے ہونے کی نئی گواہی اور نئی حالت فراہم کرتی رہتی تھی۔ ٹیکنالوجی اس احساس کو کند کر رہی ہے۔ اب 'میں' بس ایک شناخت ہے، کنڈیشن اور مستقل حال نہیں۔ مجھ کو خود مجھے محسوس کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ اگر میں اس رکاوٹ سے لڑتے ہوئے اپنے احساس و ادراک میں رہنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری شخصیت ماحول کی تائید نہ ہونے کی وجہ سے عجیب طرح کی تڑی مڑی اور introvert قسم کی شخصیت بن کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اب وہ 'تُو' ہی ہونے کی ایک دوسری روایت میں چلا گیا ہے جو مجھے 'میں' ہونے کا تجربہ فراہم کرتا رہتا تھا۔غرض اب 'میں' بھی ایک نہیں رہ گیا ہوں، میرا موبائل مجھ سے زیادہ 'میں' ہے اور میرا لیپ ٹاپ ہر 'تم' اور ہر 'وہ' سے زیادہ 'تم' اور 'وہ' ہے۔ **تو بھائی، میں یہ 'میں' نہیں ہوں بلکہ میں یہ موبائل ہوں، میں یہ DP ہوں، میں یہ ID ہوں وغیرہ۔ 'میں' کا یہ بٹوارا ہی اب میری متاعِ ہست و نیست ہے۔ مجھے تو ڈرلگتا ہے کہ کہیں ایک دن یہ موبائل فون بول اٹھے اور میری طرف اشارہ کرکے لوگوں کو بتائے کہ دیکھو دیکھو یہ 'میں' ہوں!** معاف کیجیے گا یہ شاعرانہ باتیں ہیں مگر میرے خیال میں بہت منطقی اور حقیقی ہیں۔ حالانکہ منطقی اور حقیقی میں تضاد کی نسبت ہے لیکن بہرحال۔ ویسے بھی **روبوٹ کی 'عقلمندی' کا مقابلہ شاعر ہی سے کیا جا سکتا ہے۔** آپ بھی دیکھ ہی رہے ہیں کہ آدمی خودحالی سے محروم ہوتا جا رہا ہے، غم اور خوشی وغیرہ سب مشینی سے بنتے جا رہے ہیں، احساسات میں گہرائی اور پیچ داری ایک سپاٹ اور بے جان سی سطحیت کی لپیٹ میں ہے، جذبات میں رفعت و پاکیزگی وغیرہ تو اگلوں کے چونچلے تھے، المیہ یہ ہے کہ جذبات میں حیوانیت کا زور بھی رفتہ رفتہ مدھم پڑتا جارہا ہےاور **وہ دن ایک آدھ صدی سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہ گیا جب غصہ بھی کوئی chip ڈال کر آیا کرے گا۔** غضب خدا کا! رونا چھوٹ گیا، بے بس کر دینے والی ہنسی بچوں میں بھی نظرنہیں آتی۔ غمِ حسینؓ ہمارا قومی غم ہے، میلادِ رسولﷺ ہماری ملی خوشی۔ اس غم اور اس خوشی کو بھی جگانے، ابھارنے بلکہ یاد کروانے کے لیے بھی ہمیں رلانے اور ہنسانے میں مشاق پرفارمرز کی محتاجی ہے۔ اب دیکھیے ٹھنڈی راکھ دھونکنے کا یہ عمل بھی کب تک کار آمد رہتا ہے۔ یہ جعلی عصا کب تک نقلی سلیمان کے لاشے کی تھام بنا رہے گا۔ دیکھتے ہیں کب تک!

ہم دیکھیں گے، ہاں دیکھیں گے'۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ 'کیا تم بھی دیکھو گے کیا وہ بھی دیکھیں گے؟'

تو خیر، ٹیکنالوجی کی برکت سے سبجکٹ غائب ہوتا جا رہا ہے، بس چیزیں رہ گئی ہیں اور آنکھیں۔۔۔ مغلوب آنکھیں، مجذوب آنکھیں، خالی پن سے بھری آنکھیں، ندیدی آنکھیں۔ یہ **آنکھیں صرف اور صرف لذت کی جویا ہیں اور ہر منظر کو خوشگوار یا نا خوشگوار میں سے کسی ایک تاثر میں تبدیل کرتی رہتی ہیں۔** تو بھائی، یہ خود ایک گراوٹ ہےجو آنکھوں پر بھی مسلط ہے۔ دیکھنے ہی کی بات کر لیں، کیا یہ 'اہلِ نظر' پینٹنگز دیکھنا پسند کرتے ہیں، اسی سے پتا چلتا ہے کہ آج کی آنکھیں دل اور ذہن سے، یعنی واقعی دل اور ذہن سے، اُن کی شرط پر تعلق رکھنے سے گریزاں ہیں اور ان سے لاتعلقی پر مصر ہیں۔ سامنے کی بات ہے کہ انسان سماجی وجود ہے، اس کا ہر عروج و زوال اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا کہ اس کا جذبۂ تعلق کس حالت میں ہے اور کس سطح کا ہے! ٹیکنالوجی کے نئے مظاہر نے نظامِ تعلق پر

ایسی ضرب لگائی ہےکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا تھا کہ اب خود سے بھی بھرا پھرا تعلق رکھنا دشوار سے دشوار تر ہو چلا ہے۔ اس صورتِ حال کی حقیقی تصویر کشی کوئی دو صدی پہلے اجڑی ہوئی دلی میں رہنے والا ایک شاعرکر گزرا ہے اور اس سے نکلنے کا راستا بھی وہی بتا گیا ہے:

خدا ساز تھا آزرِ بت تراش

ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

وقت تنگ ہے ورنہ اس شعر کو کھولتے اور آزرِبت تراش کی خدا سازی کا موجودہ پروجیکٹ اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے۔

سوال: لیکن کہا تو یہ جا رہا ہے، اب دنیا گلو بل ولیج بن گئی ہے، مگر ایسا لگتا ہے نزدیک بیٹھا انسان دور اور دور بیٹھا انسان قریب ہوگیا ہے، بس اتنا ہوا ہے، چاہے آپ کا تعلق کسی بھی مکتب فکر سے ہو، لیکن اس سے مخلص ہونا یقینی ہوا کرتا تھا، اب تو پوری دنیا بشمول پاکستان انحطاط پذیر ہے، آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: **یہ گلوبل ولیج سے زیادہ گلوبل جیل ہے اور طاقتور اقوام یعنی مغرب اس کا داروغہ ہے۔ قیدیوں میں پائی جانے والی ظاہری اور نفسیاتی یکسانی کو وحدت کا عنوان دیا جا رہا ہے۔** ظاہر ہے یہ ایک جبری وحدت ہے جسے آدمیت کو خیرباد کہے بغیر اور روبوٹ بنے بغیر قبول ہی نہیں کیا جا سکتا۔ امتیازات کی سمائی نہ رکھتی ہو اور ہمیں فرد سے لے کر تہذیب تک کی سطح پر ممتاز رہنے پر نہ اکساتی ہو تو کہاں کی وحدت۔ ایسی وحدت تو پتھروں میں بھی نہیں ہے۔ آپ نے اچھا کہا کہ ٹیکنالوجی نے دور کے آدمی کو قریب اور قریب والے کو دور کر دیا ہے! واہ، ماشاءاللہ۔ ایسا ہی ہوا ہےجس کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ دوری نزدیکی تجریدی سی ہوچکی ہے اور محض مفروضہ بن کر رہ گئی ہے۔ باہمی قرب و بعد سے جو احساسات متعلق تھے وہ غیر ضروری اور نامطلوب ہوچکے ہیں۔ ایک عجیب سا مزاج عالم گیر ہوتا جا رہا ہے اور **انسان کے متروک ہونے کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اپنے اندر باہر سے آدمیت کا انخلا ٹیکنالوجی سے فیض یاب ہونے کی اٹل شرط بھی ہے اور لازمی نتیجہ بھی۔** ہم تو ظاہر ہے نِتّے بچے ہیں جو سامنے آئے گا چٹ کر جائیں گے بس دسترخوان بچھا رہے اور بھرا رہے۔ آدمی نا آدمی کی بحث میں کیا رکھا ہے! اچھے بھلےلوگ ٹیکنالوجی پر تنقید سن کر بھڑک اٹھتے ہیں اور اس کے وہ فائدے گنوانے لگتے ہیں جن کا مجھے بھی اقرارہے۔ تو بہر کیف، **مغرب ہی سے کچھ امید ہے۔ اسی نے یہ خطرہ پیدا کیا اور وہی دنیا کو اس خطرے سے نکال سکتا ہے۔** دیکھیے مغرب کب بت تراشی سے بت شکنی کی طرف آتا ہے اور ہمیں اپنے تئیں آدمی بننے کا ساز و سامان عنایت فرماتا ہے۔ dehumanization کا عمل مغرب میں تو بہت ہی شدت اختیار کر چکا ہے۔ وہاں اس آفت اور بحران کا ادراک ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن بعض حلقوں کے شر سے بچنے کے لیے یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مغرب کی حیثیت ایک کلی پرسپیکٹو کی سی ہےجس کی پوری تردید کیے بغیر اسلامی اور صحیح معنی میں انسانی پرسپیکٹو کے احیا کا، تجدید کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ہمارا میڈیا اور ہماری فلمیں اور ڈرامے نوجوان نسل کو زندگی کے حقائق سے دور لے جا رہے ہیں اور لا شعوری طور پر انہیں غیر حقیقی آدرشوں کا اسیر بنا کر آخرِ کار مایوسیوں کے اندھیروں میں دھکیل رہے ہیں۔ اس کا علاج کیا ہو؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اجازت ہو تو کچھ تمہیدی باتیں کرنی ہیں۔ ہمارے میڈیا یعنی سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور فلموں ڈراموں وغیرہ کا وہی حال ہے جو شراب اور جوئے کا ہے۔ اس کا ضرر اس کے فائدے سے کہیں زیادہ ہے۔ کبھی میڈیا فلاسفی پر پچیس تیس برس سے مغرب میں جو لکھا جا رہا ہے، وہ پڑھیں تو اس مہلك ضرر کی تفصیل پتا چل جائے گی جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میڈیا فلاسفی اور کمیونیکیشن تھیوری اور کیا کہتے ہیں Mediality کے بارے میں سرسری معلومات کابھی فقدان ہے۔ آپ تو ماشاءاللہ اس میدان کے آدمی ہیں، آپ خود دیکھ لیں کہ ہمارے ماہرینِ سماجیات میں، ماہرینِ ابلاغیات میں، میڈیا کے پر جوش وکلا میں کتنے ہیں جو مثال کے طور پرایلفرڈ ہچکاک کے Untrue Shadow of Life کی سسٹمز تھیوری کو پڑھنے اور سمجھنے کی مبتدیانہ اہلیت بھی Luhmann سے سطحی طور پر بھی واقف ہوں اور رکھتے ہوں۔ اور یہ نوبت اس وجہ سے آئی ہے کہ ہر سنجیدہ بات تو ہمارے دانشوروں تك کو مشکل، بلکہ مہمل لگتی ہے۔ کسی پیچیدہ تصور، میرا مطلب ہے اپنی ساخت ہی میں پیچیدہ تصور سے ہمارے ذہن کو سرے سے کوئی مناسبت نہیں خواہ اسے اخباری زبان ہی میں کیوں نہ بیان کیا جائے۔ ایك صاحب تو اس ناچیز کے بعض لیکچرز محض اس لیے

سننے آتے ہیں کہ سوال جواب کے سیشن میں یا پھر رخصتی مصافحہ کرتے وقت اس مسکین پر ایک ناوک فگن مسکراہٹ کے ساتھ طنز کر سکیں کہ تم لفاظی اچھی کرتے ہو، تمہاری بات دل پر تو اثر کرتی ہے مگر دماغ تک نہیں پہنچتی، وغیرہ وغیرہ۔ میں مروت اور شرم کے مارے ان سے یہ نہیں کہہ پاتا کہ میاں ڈھنگ کی تحریریں پڑھا کرو تا کہ تمہاری ذہنی گراوٹ اور بے مایگی کا اتنا تو ازالہ ہو جائے کہ جن باتوں کو تم لفاظی کہتے ہو، وہ باتیں تمہارے اندر کم از اکم اتنا احساس تو پیدا کر سکیں کہ ابھی تمہیں بہت کچھ جاننے کے ضرورت ہے۔ اس طرح کے لوگ ہیں، مظلوم لوگ، جنھیں دیکھیں تو میڈیا کے مظالم میں سے ایک ظلم کا گویا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ وہ ظلم ہے مفلسوں کو متکبر بنانا اور جن کے پلے میں کچھ ہے، ان بچاروں کو اس guilt میں مبتلا کر دینا کہ ہم نے ساری عمر جو سکے جمع کرنے میں لگا دی، وہ تو آج کی مارکیٹ میں چلتے ہی نہیں۔

کسی پیچیدہ تصور، میرا مطلب ہے اپنی ساخت ہی میں پیچیدہ تصور سے ہمارے ذہن کو سرے سے کوئی مناسبت نہیں خواہ اسے اخباری زبان ہی میں کیوں نہ بیان کیا جائے۔

کسی بھی علم کی بنیادی اصطلاحات دیکھ لیں، ان سے واضح ہو جائے گا کہ **علم میں جب بلوغت کا مرحلہ آتا ہے تو اس کے مباحث پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں اور اظہار کا اسلوب بھی کچھ ثقیل اور مغلق سا ہو جاتا ہے۔** لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ کوئی قسمت کا مارا ہم سے ہمدردی کرتے ہوئے، ہماری ذہنی پسماندگی کا لحاظ کرتے ہوئے خیال کی پیچیدگی کو ذرا آرائشی زبان میں حسنِ اظہار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑے تحکم سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ کی بات محض تاثراتی ہے، ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ اور اگر یہ شکایت دور کرنے کے لیے اسی خیال کو معیاری علمی زبان میں کہا جائے تو پھر مشکل وشکل کا شور مچ جاتا ہے۔ میں نے کئی بڑے دماغوں کو اس فکر میں گھل گھل کر ضائع ہوتے دیکھا ہے "کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام: مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا"۔

میڈیا باقاعدہ ایک کارپوریشن ہے اور کیپیٹلزم کے ایجنڈا کو تیزی سے عمل میں لانے کا شاید سب سے طاقتور ٹول ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہچانے بغیر ہم اسی طرح اس کی غلامی کرتے رہیں گے اور اس غلامی کو طرح طرح کے خوش نما نام دے کر میڈیا کے احسانات گنواتے رہیں گے۔ کوئی بچارا اس پر تنقیدی نظر ڈالنے کی جسارت کر لے تو اس کے جواب میں تمدنی ارتقا، اصولِ تغیر، سماج کی گلوبلائیزیشن وغیرہ کا رٹا ہوا بھاشن سنا دیا جاتا ہے ایک ایمانی جذبے کے ساتھ۔ میڈیا کے سلسلے میں ان پر جوش اور پر شور احسان مندوں کی یلغار اتنی کثیر الاطراف ہے کہ بڑے موضوعات پر غور کرنے والے اور ذرا گہرائی کے ساتھ سوچنے والے ڈیفیٹزم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ ہر کانا بھینگا سیاہ چشم بنا کہتا پھر رہا ہے کہ:

بے نیازانہ ز اربابِ کرم می گزرم

چون سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گزرد

فحاشی اور بے حیائی وغیرہ پر دبی زبان میں بھی اعتراض کرو تو بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے طعنے ملتے ہیں۔ ارے بھائی، ہم مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ سب چیزوں کو اسلامی پرسپیکٹو ہی سے دیکھیں گے۔ اس میں حیرت اور شکایت کی کیا بات ہے، اور اس کے جواب میں انسانی حقوق کی فہرست منہ پر مارنے کی کیا ضرورت ہے! ہم اس میں غلطیاں بھی کرتے ہیں، اور ان غلطیوں میں بعض یقیناً بہت بھیانک ہیں لیکن بہرحال ان غلطیوں کی تصحیح بھی اسلام ہی سے ہو گی۔ انہیں ٹھیک کرنے کے لیے ہم کہیں اور سے ہدایت نہیں لیں گے۔ ہاں فطریات میں، ہر طرح کے غیر مذہبی علم میں، سماجی مینیجمنٹ میں، غرض ایسے تمام علمی عملی امور میں دوسری روایتوں سے ممنونیت کے ساتھ استفادہ کریں گے جن میں غلطی پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے، **مسلمان کسی بھی صورت حال میں اپنے پرنسپل پرسپیکٹو سے دست برداری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہر تہذیب ایک ورلڈ ویو رکھتی ہے اور اسی مین رہتے ہوئے چیزوں کو رد و قبول کرتی ہے۔** این گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند۔ البتہ ہماری کوتاہی یہ ہے کہ قانونِ تغیر سے effectively ہم آہنگ اور ہم قدم رہنے والے علوم و فنون صدیوں سے ہماری دسترس سے بالکل باہر ہیں۔ **تاریخ سے لاتعلق ایک کند ذہن اور سوئی سوئی سی قدامت پسندی دنیا کو ہم پر ہنسنے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔ اور چیزوں کے علاوہ اس کمزوری کو بھی میڈیا خوب ایکسپلائٹ کر رہا ہے اور ایک بیڈروم ماڈرنٹی کو تہذیبی گھٹن کے واحد علاج کے طور پر پھیلا رہا ہے۔**

اب آپ کے سوال پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

ہماری ڈرامے اور فلمیں تو خیر سے بڑے سے بڑے خیال اور جذبے کو ولگرائز کر دکھاتی ہیں۔ یہ آئڈیلسٹ وغیرہ نہیں بناتیں، یہ بس ذہن اور طبیعت کو گندگی میں لتھڑے رہنا سکھاتی ہیں۔

ہماری فلمیں اور ڈرامے کم از کم دو بڑی خرابیاں نوجوانوں میں پیدا کر رہے ہیں۔ ایک ترسنے کی کیفیت اور دوسرے بد ذوقی اور گھٹیا پن۔ اس لیے انھیں اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کی تباہی کا ایک بڑا سبب قرار دینا غلط نہیں ہے۔ جب آدمی ترسنے کی مستقل کیفیت میں رہنے لگتا ہے تو اس میں جنسی پرورژن، دہشت گردی کی طرف میلان اور لوٹ مار کا جذبہ پیدا ہو جانا تو سامنے کی بات ہے۔ بنیادی خرابی وہ کابوس یعنی incubus ہے جو clinical schizophrenia سے زیادہ خطرناک ہے اور سوسائٹی کے لیے بھی بڑا خطرہ ہے۔ **ترقی، دولت، طاقت وغیرہ مختلف شہوتیں بدروحیں بن کر اس طرح مسلط ہو جاتی ہیں کہ آدمی خود اپنے لیے ناقابلِ شناخت ہوتا چلا جاتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ اپنے ذہن سے محو ہو کر بس جبلتوں کے آتش فشاں کا لاوا بن کر رہ جاتا ہے۔** جن لوگوں خصوصاً نوجوانوں کو یہ لت لگ جاتی ہے ان کا تخیل اور احساسات حقیقی زندگی سے کوئی نتیجہ خیز تعلق پیدا کرنے کے قابل نہیں رہ جاتے۔ وہ تاریخی اور عملی دنیا سے ہجرت کر کے ایک ایسی خیالی جنت کی شہریت لے لیتے ہیں جو حشیشئین کے بھی کسی بدذوق ڈرافٹسمین کے نقشے پر بنی ہے۔ اور ہمارے ڈرامے اور فلمیں تو خیر سے بڑے سے بڑے خیال اور جذبے کو ولگرائز کر دکھاتی ہیں۔ یہ آئڈیلسٹ وغیرہ نہیں بناتیں، یہ بس ذہن اور طبیعت کو گندگی میں لتھڑے رہنا سکھاتی والے cult of ugliness ہیں۔ ایسی گندگی میں جس پر مذہبی آدمی ہی نہیں بلکہ بادلئیر کے ہم مشرب بھی حتیٰ کہ بھی تھو تھو ہی کریں گے۔ **آدمی بھلے سے گناہ گار ہو مگر گناہ کا بھی ایک لیول ضروری ہے ورنہ آدمی ہونا مشکوک ہو گا۔ کسی شخص کو جانچنا ہو تو یہ بعد میں دیکھنا چاہیے اس میں کمالات کیا کیا ہیں، پہلے یہ دیکھا کریں کہ اس کی کمزوریوں میں گراوٹ اور بدصورتی تو نہیں ہے؟** افسوس نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد اس پرکھ پر پوری نہیں اترتی۔ اور اس کی ذمہ داری ہمارے میڈیا پر بھی جاتی ہے جو آزادی کا جو تصور رکھتا ہے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے وہ انسانی نہیں ہے، نرا حیوانی ہے۔ اس کے منہ پر معاشرے کے مطالبے اور مفاد میں تھوبڑا نہ کسا گیا تو یہ سب کچھ چٹ کر جائے گا اور آدمیت کی رہی سہی کھیتی بھی اجاڑ دے گا۔ اور ان فلموں اور ڈراموں نے اخلاقی بحران کے علاوہ جو جو جمالیاتی فساد پیدا کیا ہے، اس پر تو یقین ہے کہ وہ لوگ بھی کراہت بلکہ آج کی زبان میں کراہیت محسوس کریں گے جن کی ذوقی تربیت سعادت اللہ خان رنگین اور نواب مرزا شوق نے کی ہے۔

اور افسوس یہ سب اس ملک میں ہو رہا ہے اور روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے جسے ریاست مدینہ کی طرز پر بنانے کے دعوے کیے جا رہے ہیں۔ بر عکس نہند نامِ زنگی کافور۔

ان فلموں اور ڈراموں نے اخلاقی بحران کے علاوہ جو جو جمالیاتی فساد پیدا کیا ہے، اس پر تو یقین ہے کہ وہ لوگ بھی کراہت محسوس کریں گے جن کی ذوقی تربیت سعادت اللہ خان رنگین اور نواب مرزا شوق نے کی ہے۔

اس دنائت پر میں تو خود کو دینی موقف اختیار کرنے کا سر سے پاؤں تک پابند محسوس کرتا ہوں اور اس موقف کے اظہار کو اپنی سب سے بڑی ذمہ داری بلکہ فخر جانتا ہوں لیکن چونکہ پاکستانی مسلمانوں نے خود پر دین ہی کو بے اثر بنا رکھا ہے تو بچارا دینی موقف کیا کر لے گا۔ اس لیے میں اپنے ایک دوست کی بات کوٹ کرتا ہوں جو پیدائشی مارکسسٹ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ٹی وی ڈراموں میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ مفتیانِ دین کے فتوے میں ناجائز ہے لیکن اگر مجھے قاضی لگا دیا جائے تو میڈیا اور پیمرا دونوں کو قتلِ عام کے جرم میں لٹکانے کا حکم دے دوں۔ میں بہرحال ان کے اس حکم پر خوش ہونے کے باوجود اس سے اختلاف کروں گا۔ اب تو ٹھیک ہے ناں!

تو جناب میڈیا جدید دنیا کی شاید سب سے مؤثر قوت ہے۔ یہ انسان کی فطرت تک کو تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ ہیومن پرسپشن پر اثر انداز ہو چکا ہے۔ فلموں، ڈراموں وغیرہ میں احساسِ ذمہ داری اور تخلیقیت پیدا ہوئے بغیر آپ نے جس سنگین مسئلے کی نشاندہی فرمائی ہے وہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور میڈیا میں ذمہ داری کا شعور اور تخلیقی جوہر ریاست کی مداخلت اور سوسائٹی کی حساسیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ سب کچھ موجودہ ریاستی اور معاشرتی در و بست میں پہلا صور پھونکے جانے تک تو ممکن نہیں ہے۔ **اب یا تو قومی خیر خواہی کے جذبے سے کوئی بہت ہی بنیادی سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی کثیر الجہات انقلاب لائیے ورنہ اسی طرح پریشان اور فکر مند ہونے کی اداکاری کرتے رہیے۔** اللہ اللہ خیر سلا۔ تبدیلی کا نعرہ لگانے والوں نے بھی فی الحال تو اس شاعر کی طرح مایوس اور کسی قدر بے پروا کر رکھا ہے جس نے یہ شعر کہا تھا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ، غنودیم

مذہبی علوم اور کردار میں انسان دوستی کا عنصر کم ہو گیا ہے، اس کمی کو ایک بھیانک دینی نقص سمجھ کر اس کا ازالہ نہ کیا گیا تو اسلام پر انسان دشمنی کا بہتان دنیا کے لیے قابلِ قبول ہوتا جائے گا۔

طاقت کے بغیر گداگری ہی ہو سکتی ہے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ طاقت جو نظریے پر یقین و استقامت اور علم سے پیدا ہوتی ہے اور انصاف کے آئڈیل کو عمل میں لاتی ہے۔ اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ **علم اگر نظریاتی نہ ہو تو اس کے اخلاقی نتائج نہیں نکلتے جو اجتماعی وجود کی تعمیر، تشکیل اور حفاظت لیے لازماً درکار ہیں۔** اسی لیے میں تو ایک تکیہ کلام کی طرح دہراتا رہتا ہوں کہ مذہبی علوم اور کردار میں انسان دوستی کا عنصر کم ہو گیا ہے، اس کمی کو ایک بھیانک دینی نقص سمجھ کر اس کا ازالہ نہ کیا گیا تو اسلام پر انسان دشمنی کا بہتان دنیا کے لیے قابلِ قبول ہوتا جائے گا۔ یہاں میں انسان دوستی کو ایک سادہ لفظ کے طور پر استعمال کر رہا ہوں، یہ ہیومن ازم کا ترجمہ نہیں ہے۔ اور ہمیں یہ بھی سمجھنا ہو گا کہ طاقت اپنے فزیکل مفہوم میں بھی دیوار گرانے کے لیے نہیں، دیوار بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ فلاحی ریاست اور خود احتساب معاشرہ بنا کر ہی شریعت کا نفاذ ہو سکتا ہے ورنہ تو قوانین اور عملی سماجی اقدار اسی طرح مغائرت اور تصادم میں رہیں گی۔

سوال: پاکستان میں تھیٹر، ٹیلی وژن اور فلم میں سب سے زیادہ پاکستان کے جس ادیب پر کام ہوا، وہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ حال ہی میں انڈیا میں بھی ان پر ایک فلم بنائی گئی۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ منٹو پاک و ہند میں بہت مقبول ادیب ہیں، اب تک مقبول ہیں لیکن ان کی مقبولیت کا بڑا حوالہ جنسیات ہےجبکہ خود منٹو اپنے بارے میں کہتے تھے کہ وہ معاشرے کا احوال لکھ رہے ہیں اور باشعور طبقات کا بھی خیال یہی ہے، اس کے باوجود منٹو نے اپنی زندگی میں کئی پابندیاں جھیلیں، مقدمات بھگتے اور مرنے کے بعد بھی ان پر انڈیا سے آنے والی فلم پابندی کا شکار ہوئی، تو آپ اسے کس طرح دیکھتے ہیں؟

ہم ایک متعفن گھٹن اور سڑاند میں رہنے کے شوقین ہیں۔ جو چیز جتنی زیادہ سڑی ہوئی ہوگی، وہ ہمیں اتنی ہی لذیذ لگے گی۔ منٹو اپنی سوسائٹی کی یہ خاصیت اچھی طرح جانتے تھے اور اسی سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور قبولِ عام پایا۔

جواب: منٹو نے اپنے بارے میں جو کہا وہ ٹھیک ہی ہے مگر جنسیت کی طرف ان کا رجحان معاشرے کی احوال نگاری کے منصوبے یا جذبے سے بہت زیادہ ہم آہنگی اور مطابقت نہیں رکھتا۔ کوئی وجہ تو ہوگی کہ جوائس اور لارنس اور بہت سے پردہ در فکشن رائٹرز کی طرح ان کے ہاں لذت و الم ایک متوازیت کے ساتھ محسوس نہیں ہوتے۔ یعنی **جنسی معاملات کا فحش کی حدکو پہنچا ہوا بیان تلذذ کو بھی المیہ کیفیت بنانے سے قاصر کیوں رہ جاتا ہے؟** اصل میں ہم ایک متعفن گھٹن اور سڑاند میں رہنے کے شوقین ہیں۔ جو چیز جتنی زیادہ سڑی ہوئی ہوگی، وہ ہمیں اتنی ہی لذیذ لگے گی۔ منٹو اپنی سوسائٹی کی یہ خاصیت اچھی طرح جانتے تھے اور اسی سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور قبولِ عام پایا۔ یہاں ذرا سا رُک کر اتنی وضاحت کر دوں کہ سڑاند کی بات میں نے محض کسی مذہبی اور خاص طرح کے اخلاقی سیاق و سباق میں نہیں کی یہ بس ایک ادبی اور سماجی بات ہے اور اس کا تناظر جمالیاتی ہے۔
یہ وضاحت بھی ضروری تھی ورنہ بہت سے مہربان صرف میری داڑھی ٹوپی دیکھتے ہیں، انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ سنو، آخر بک کیا رہا ہے! مدت پہلے اسی طرح کے ایک عزیز کو پرچانے اور ان کا دل اپنی طرف سے نرم کرنے کے لیے میں نے انھیں ان کے ممدوح غالب کا ایک شعر سنایا: زمن حذر نکنی گر لباسِ دیں دارم /نہفتہ کافرم وبت دراستیں دارم۔ وہ ٹھہرے بلا کے کائیاں اور غضب کے سخن شناس۔ بولے، ہم بت پرستوں کو تو بالکل ہی اچھا نہیں سمجھتے۔ میں لاجواب ہوگیا اور ان سے معذرت کی اور اللہ سے بھی معافی مانگی۔

تو بھائی بات یہ ہورہی تھی کہ منٹو کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب منٹو کے منصوبے کو نہ سمجھنا ہے۔ لذت پسندی ہمارا عمومی مزاج ہے۔ ہمیں جو چیز مزے دار نظر آتی ہے، اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ لذت اور تھرل اور جبلی قسم کی آزادی یا بے قیدی، یہ ہمارے پیٹنٹ خواص ہیں۔ منٹو کے ہاں ان کی تسکین دکھائی دی تو ادھر کو دوڑ پڑے اور اب جون ایلیا پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ **ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ منٹو سوسائٹی کو آئینہ دکھا رہا ہے یا جون ایلیا ایک وجودیاتی زلزلے کو خود میں جذب کر کے اظہار دے رہا ہے۔ ہمیں تو وہ مزے دار انکار اچھا لگتا ہے جو دونوں کے یہاں ابلا پڑ رہا ہے۔** ہمیں اس سے بھی کوئی مطلب نہیں کہ جس انکار وغیرہ کا ہم چسکا لے رہے ہیں، اس کے لیے منٹو نے مقدمات بھگتے اور جون ایلیا نے خون تھوکا۔ ویسے میرے عزیز، منٹو کی اہمیت ماننے کے باوجود میں ان کے پرستاروں میں نہیں شامل۔ ان کی اکثر و بیشتر کہانیاں ہنگامی نوعیت کی ہیں اور معمولی درجے کی ہیں۔ میں ان کے مداحوں کی، جن مین میرے دادا استاد محمد حسن عسکری بھی ہیں، اس بات کو سرے سے ناقابلِ تسلیم سمجھتا ہوں کہ منٹوکا قلم گویا ایک پختہ کار دروں بیں سرجن کا نشتر تھا جس سے وہ

معاشرے کے جسم پر نکلے ہوئے پھوڑوں کی جراحی کرتے تھے۔ مجھے یہ ماننے میں کوئی تکلف، کوئی تامل نہیں کہ منٹو کا قلم نشتر تھا، یقیناً تھا۔ تاہم اس نشتر سے ختنے تو کیے جا سکتے ہیں مگر کوئی بڑی اور پیچیدہ جراحی نہیں۔

سوال: مگر معاشرے میں مذہبی رجحانات بھی تو زور پکڑ رہے ہیں، معاشرہ شدت سے مذہب پرست بھی تو ہوتا جا رہا ہے؟

جواب: حضور، **جذبات کی جس گھٹن نے منٹو کو مجاہد بنایا اسی گھٹن نے مذہبی زندگی کے ایک حصے میں تشدد پسندی وغیرہ کو پیدا کیا۔** اور آیت اللہ صادق الخلخالی اور مفتی احسان ایسے مجاہدینِ ملت کو جنم دیا۔ تشدد پسندی ہی کیا، اس گھٹن نے ایک طرح کا ہیڈنزم بھی پیدا کیا۔ ایک مبلغ صاحب نے حال ہی میں جنت کی حوروں کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ کبھی سنیے گا۔ یوں لگے گا جیسے پنڈت کوکا پرشاد بول رہے ہیں۔ لیکن نہیں، پنڈت کوکا پرشاد اتنے ان گھڑ، بے سلیقہ اور بد تخیل نہیں تھے۔ پنڈت جی اگر حور کی تصویر کھینچتے تو وہ کم وبیش حور ہی رہتی، اس عفیفہ کو پامیلا اینڈرسن نہ بناتے۔ تو خیر، جن جذبات کی بات ہو رہی ہے مذہب کو بھی انھی جذبات کا ایندھن بنا دیا گیا۔ مطلب، خدا کا اقرار اب اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا جتنا انسان کا انکار۔ خدا اور انسان میں جیسے ایک تصادم پیدا کر دیا گیا ہے۔ **ایک سوٹڈ بوٹڈ طبقہ انسان کا اثبات کرنے کے لیے خدا کا انکار ضروری سمجھتا ہے اور ایک مقطع چقطع طبقہ جو ہماری شامتِ اعمال سے مذہبی کہلاتا ہے، وہ خدا کے اقرار کے لیے انسان کا انکار فرض جانتا ہے۔ وہ انسان کی تحقیر کیے بغیر خدا کی تعظیم نہیں کر سکتا۔** تو عجیب طرح کے ادھورے لوگوں کی جنگ ہے جس کا نتیجہ بد قسمتی سے پورا نکل رہا ہے۔ اس لڑائی سے جو غبار اٹھ رہا ہے، ہم آپ اسی میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ یہ غبار اتنا تیزابی اور زہریلا ہے کہ جسم تو کیا روح کا بھی گلا چھل گیا ہے۔ اور **یہ افتاد اصل میں مذہبی لوگوں پر، یعنی حقیقتاً مذہبی لوگوں پر پڑی ہے۔ غیر مذہبی لوگوں کی تو خیر سے روح ہوتی ہی نہیں۔**

سوال: یہ جو ادھوری لڑائی ہے، صرف ہمارے ہاں ہی ہے یا مغرب بھی اس سے نبرد آزما ہے؟

جواب: ارے جناب، مغرب تو اس مہا بھارت کا کرشن مہاراج ہے۔ اس رزمیہ کا مصنف اور ہدایتکار وہی تو ہے۔ مغرب نے بڑی کامیابی کے ساتھ خود کو روحِ عصر منوا لیا ہے، یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی۔ وہ نبرد آزما نہیں ہے، نبرد آرا ہے۔

سوال: جس طرح ہمارے ہاں نظامِ سیاست ہے، ٹوٹتی بنتی حکومتیں ہیں، پھر عوام کی دگرگوں معاشی بدحالی، بے روز گاری، مہنگائی وغیرہ، سب کچھ ہمارے معاشرے میں بدرجۂ اتم موجود ہے تو اس میں عوام بچارے بھی کیا کریں، انھیں جدھر تسکین محسوس ہوتی ہے، وہ وہاں کو ہو لیتے ہیں، آخر کار وہ بھی کیا کریں، انہیں بھی تو کوئی مسیحا نہیں دکھائی دے رہا؟

جواب: ہمارے عوام اتنے بھی بچارے اور بھولے نہیں ہیں کہ جو چاہے انھیں اپنے پیچھے لگا لے۔ **مسائل اور مصائب کی جڑ ہم عوام ہی ہیں۔** جس شخص نے متحدہ پنجاب کے ایک الیکشن میں علامہ اقبال کو دھوتی اٹھا کے دکھائی تھی وہ اقبال کی شہرت سے، حیثیت سے، مرتبے سے بے خبر نہیں تھا لیکن چونکہ اقبال اس کی برادری کے ایک اجھل شخص کے مخالف امیدوار تھے لہذا اس نے اپنی دانست میں ان سے بدلہ لے لیا۔ وہی شخص آج بھی ہمارے عوامی کردار کا اصلی نمائندہ ہے۔ **یہ مسیحا وغیرہ کا انتظار محض ڈراما ہے۔** ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسیحا اگر سچ مچ آبھی گیا تو وہ اور کام بعد میں کرے گا، پہلے ہم سے کہے گا: "قم"! اور اسی طرح معیشت وغیرہ کا طاعون ٹھیک کرنے سے پیشتر وہ ہمارے کوڑھ کا علاج کرے گا۔ اور یہ ہمیں منظور نہیں ہے۔ **ہم خود کو بدلے بغیر اپنے حالات کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔**

ایک واقعہ سناتا ہوں جو کہہ لیں کہ خود میرے ساتھ بیتا۔ میرے تین آسٹرین دوست ہیں، نومسلم ہیں یعنی واقعی مسلمان ہیں۔ ان میں ایک صاحب اسلام قبول کرنے سے پہلے وہاں کے مشہور مصور تھے، محمد ابوبکر میولر، دوسرے فزیشن ہیں، ڈاکٹر محمد یحیی گراسل اور تیسرے صاحب محمد اسماعیل ایجوکیشنسٹ ہیں، ان کے آسٹریا اور فرانس اور شاید جرمنی میں بھی کئی اسلامک اسکول ہیں۔ ان تینوں نے جب اسلام قبول کیا تو ان کا جی چاہا کہ کسی مسلم معاشرے میں جا رہیں۔ ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور یہاں کوئی ڈھائی تین برس رہے مگر پھر تنگ آگئے اور یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ **یہاں ہم تو جیسے تیسے رہ لیں گے لیکن ہمارے بچے مسلمان نہیں رہیں گے۔ یہاں ایمان کی نگہ داشت زیادہ مشکل ہے، اگر اور رہ گئے تو یہ بھی بھول جائیں گے کہ ہم انسان ہیں۔** یہ سن نوے بانوے کی بات ہےجو اس وقت تو بہت بری اور دل شکن لگی تھی مگر اب بار بار یاد آتی ہے۔ آپ خود سوچیے کہ وہ قوم کسی مسیحا اور رہنما کی آرزو میں سچی ہو سکتی ہے جو ٹریفک قوانین کی بھی پابندی نہیں کرتی، قطار بندی سے بھی نابلد ہےاور موروثی سیادت و قیادت پر بضد ہے؟ بھلا دودھ میں ہلاکت گھولنے والی قوم کسی مسیحاکا انتظار deserve کرتی ہے؟

ہاں، یہ بات ایک خاص اینگل سے درست ہے کہ نظام چوپٹ ہونے اور معیشت خراب ہونے کی وجہ سے غریبوں میں، عام آدمیوں میں بقولِ غالب اک گونہ بے خودی کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ طلب

ہمیشہ پستیِ ذوق ہی کیوں پیدا کرتی ہے؟ ہم بعض معاملات میں یقیناً مجبور اور معذور ہیں لیکن ہمیں بالکل سادہ معنی میں اچھا آدمی، بھلا پڑوسی اور مفادِ عامہ میں بنائے گئے قوانین کی پابندی کرنے والا شہری بننے سے کس نے روکا ہے؟ **ہم بس یہ رٹے جا رہے ہیں کہ جب اچھا لیڈر آئے گا، اچھی حکومت بنے گی تو ہم بھی اچھے ہو جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ نہ اچھا لیڈر آئے گا نہ ہمیں اچھا بننا پڑے گا۔** ہمیں بالکل معلوم ہے کہ ہم چاہیں تو لیڈروں کے حاضراسٹاک کو بھی اچھا بننے پر مجبور کر سکتے ہیں مگر ہم ایسا کبھی نہیں کریں گے کیونکہ اس کے لیے پہلے ہمیں خود کو بدلنا پڑے گا۔ **ہم اچھائی کی ایک deferred خواہش بھی رکھتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں کہ کہیں پوری ہی نہ ہوجائے۔** ہمارا تو وہ حال ہے کہ مجھ ایسا آدمی یہ دعا تو پورے خشوع وخضوع سے کرتا ہے کہ یا اللہ مجھے چنگیز نہ بننے دینا، مجھے ہلاکو نہ بننے دینا، مجھے مودی نہ بننے دینا لیکن اللہ سے یہ کبھی نہیں مانگتا کہ مجھے کرپشن سے بچانا، ملاوٹ کرنے سے روکنا، خود غرضی سے محفوظ رکھنا، مجھ سے لوگوں کی دل آزاری نہ ہونے دینا وغیرہ۔ اب ظاہر ہے کہ **میں انھی گناہوں سے بچنا چاہتا ہوں جن گناہوں کے ارتکاب کا مجھ سے نہ کوئی امکان ہے اور نہ مجھ میں ان گناہوں کی سکت ہے۔ جو خرابیاں، یا یوں کہہ لیں کہ لذت اور راحت فراہم کرنے والی خرابیاں میرے اندر پائی جاتی ہیں، ان سے پاک ہونے کا خیال بھی میرے لیے ڈراؤنا ہے۔**
جیسے ایک شخص یہ رٹی ہوئی دعا کرتا ہے کہ یا رب العالمین! مجھے سب گناہوں سے محفوظ رکھنا، اور اس دوران میں اسے جیسے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میں کیا مانگ رہا ہوں تو وہ ڈر جاتا ہے کہ کہیں یہ دعا قبول ہی نہ ہو جائے۔ تو جناب، ہمیں اپنے حقیقی مفادات کا بے نفسی اور بے غرضی کے ساتھ شعور ہونا چاہیے اور خیر کے انقلاب میں جو ایثار درکار ہوتا ہے اس کے لیے آمادہ رہنا چاہیے اور مثبت سماجی تبدیلیوں کے واضح تصور کے ساتھ ایک منظم تحریک کا ڈول ڈالنا چاہیے ورنہ ہم اس نجات دہندہ کے انتظار کا ڈھونگ رچاتے رہیں گے جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تو بھائی، جس کا انتظار ہے، کوشش کرو کہ وہ خود بن جاؤ۔ یہی قومی زندگی کے تمام مسائل کا حل ہے۔

فرد کی طرح سوسائٹی کی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ ہمارے سماج کی شخصیت بہت چھوٹی ہے۔ اس میں بہت سے شانہ بہ شانہ تضادات ہیں۔ مثلاً ایک تضاد یہ ہے کہ ہم جن عقائد یا نظریات کو مانتے ہیں، جھوٹ موٹ نہیں بلکہ واقعتاً مانتے ہیں، ان سے خوف زدہ رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اور ہمارے بیچ ایک بڑھتا ہوا فاصلہ برقرار رہے۔ اس کوشش میں ہم ہر اس چیز کو لپک کر قبول کر لیتے ہیں جو ہمیں ہمارے نظریات کی ذہنی، اخلاقی، عملی تاثیر کی زد میں نہ آنے دے۔ جدیدیت کے اکثر مظاہر، تہذیبی، سیاسی، معاشی، سب، ہم نے اسی نفسیات کی وجہ سے اختیار کیے ہیں۔ **minimalism اسی لیے کامیابی کے جھنڈے گاڑتا جا رہا ہے اور ہماری مذہبی روایت میں تجدد اور یار لوگ اسے حقیقی اسلام، خالص اسلام وغیرہ کا نام دے کر اپنے اندر پیدا ہو سکنے والے احساسِ جرم کا گلا گھونٹ لیتے ہیں۔** جدیدیت نے موجودہ لٹرلسٹ تجدد کو اس مہارت سے تصنیف کیا ہے کہ بہتیرے جذبات و احساسات جو اپنی ساخت میں دینی- تہذیبی ہیں، ہمارے لیے باعث شرم اور وجود کے تاریک ماضی کے باقیات بنتے جا رہے ہیں۔ جیسے حمیت، جیسے وفاداری، جیسے حیا وغیرہ وغیرہ۔ **شخصیت کے اور تہذیب کے دینی عناصر آج از روے نص غیر ضروری قرار دیے جا رہے ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔**
تو ہاں، سوسائٹی کی شخصیت کی بات چل رہی تھی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ شخصیت اتنی چھوٹی ہے کہ اچھائیاں بھی پستہ قد ہیں اور برائیاں بھی بونی ہیں۔ مطلب، **انسان میں بعض برائیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جن پر وہ اکڑ سکتا ہے، لیکن ہم سے یوں لگتا ہے کہ ابلیس بھی خوش نہیں ہے۔ چھوٹی شخصیت ڈھنگ سے egoist بھی نہیں بن پاتی۔** انا شہد کی مکھی میں ہوتی ہے، ہر گھورے پر بھنکنے والی مکھیاں نہ گھمنڈی ہوتی ہیں نہ منکسر المزاج۔ بائی دا وے، **انکسار کے لیے انا زیادہ ضروری ہے۔** اس انتہائی غیر انسانی فضا کو بدلنے کے لیے ذہن کے ساتھ ذوق کی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ تو ہمیں دیکھنے والا تمسخر یا مایوسی سے یہی کہے گا کہ "سیاہی از حبشی کے رود کہ خود رنگ است"۔
سوال: اسی تناظر میں ہم پاکستان کے مختلف نظامِ تعلیم کی بات کریں تو وہ کئی قسم کے ہیں، جن میں کیمبرج سسٹم، پاکستانی تعلیمی نظام اور پھر مدرسوں کا نظامِ تعلیم اور دیگر شامل ہیں۔ تو کیا یہ بٹا ہوا نظامِ تعلیم معاشرے کو اچھے اذہان فراہم کر سکے گا؟
جواب: ہمارے یہاں تعلیم کے نظام نصاب وغیرہ کا موضوع بس ہوا میں تیر چلانے کی دعوت دیتا ہے۔ اظہارِ خیال کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہونا ہوانا کچھ نہیں، بس اپنی اپنی اپج اور مفکرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر دو، ہماری ذمہ داری پوری ہو جائے گی۔ نہ پڑھنے والے تعلیم کا کوئی تصور رکھتے ہیں نہ پڑھانے والے اور نہ ہی تعلیمی نظام

بنانے والے۔ اگر ٹوٹا پھوٹا تصور رکھتے بھی ہیں تو اس کے لیے حساس نہیں ہیں۔ ہم لوگ ہر مسئلے پر اور ہر بحران سے نکلنے کے لیے بس فرمائشوں کی ایک فہرست تیار کرکے اسے عریضہ بنا کر نیٹی جیٹی کے پل پر کھڑے ہو کر گدلے سمندر میں گرا آتے ہیں اور فارغ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں خود یقین ہوتا ہے کہ یہ سب قابلِ عمل نہیں ہے کیونکہ عمل کروانے والا ہی غائب ہے۔ اور صرف عمل کروانے والا ہی غَیبت میں نہیں ہے بلکہ فرمائش کرنے والے بھی بس دکھاوا ہی کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ آئیڈیلزم اور پروفیسری بگھارنے کو سرِ دست ایک طرف رکھ کر ہمیں پہلے یہ طے کرنا ہو گا کہ تعلیم کسے کہتے ہیں؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ان جنرل مقاصد میں ہماری صورت حال اور ضروریات سے مطابقت رکھنے والے مقاصد کون سے ہیں؟ ان مقاصد کے حصول میں جن وسائل کی ضرورت ہے ان میں کتنے ہمارے پاس ہیں اور کتنے ہمیں منصوبہ بنا کر حاصل یا پیدا کرنے ہیں؟ ہم جو علوم اپنے لوگوں کو پڑھائیں گے ان کی بالعموم دنیا کے لیے اور بالخصوص ہمارے لیے افادیت کیا ہے، اور ان کی مارکیٹ ویلیو کیا ہے یا کیا بنائی جا سکتی ہے؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ استاد کہاں سے آئیں گے اور کیسے تیار ہوں گے؟ یہ بنیادیں تیار ہو جائیں تو اب خصوصی تعلیم یعنی specialized education کے مختلف اسٹرکچر کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔ مدرسے، یونیورسٹی، خانقاہیں، اصحابِ علم و فن کی بیٹھکیں وغیرہ۔ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تعلیم کا نظام، نصاب، نتیجہ وغیرہ کسی بھی پہلو سے ہمارے تصورِ علم سے متصادم نہ ہو۔ مطلب، اس تصورِ علم سے جو ہم نے بنایا نہیں ہے، ایک متواتر یقین کے ساتھ مانا ہے۔ یہ بات اعتماد اور اصرار سے کہنی چاہیے کہ ہمارا پرنسپل تناظر ایمانی ہے اور ہماری ہر علمی ذہنی اخلاقی سرگرمی اسی تناظر میں ہو گی۔

ہماری روایت یہ ہے کہ علم یعنی دنیا کا علم، انسان کا پیدا کردہ علم بھلے سے غلط ہو مگر خدا کی معرفت اور اس کی کیفیت میں اضافہ کرتا ہے۔ یعنی علمِ صورت میں غلطی بھی علمِ حقیقت کا کوئی نہ کوئی روزن کھول دیتی ہے۔ اب اس کے بعد نصابِ تعلیم ایک ہو یا دس، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس تعلیمی نظام کو طبقاتی نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی یہ نہیں ہونا چائیے کہ امیر کے لیے ایک نظام اور غریب کےلیے دوسرا۔

تو واضح ہے ناں کہ تعلیم کا سارا نظام پیدا ہوتا ہے اپنی ضرورت علم سے، اپنے تصورِ علم سے، اپنے مقصود علم سے اور اپنے پرسپیکٹو سے۔ ورنہ تو علم اپنا اپنا گمان ہے، انارکی ہے، 'توہم کا کارخانہ' ہے۔ یہ قیدیں نہ لگائی جایں تو ہر علم صحیح ہے اور ہر علم غلط ہے۔ تو بھائی، **علم پوزیشننگ ہے ورنہ تو تعلیم کا وہی حال ہو گا جو ہمارے جدید تعلیمی اداروں پر مسلط ہے، جہاں سے بس ناچ گانا ہی سیکھا جا سکتا ہے، اور وہ بھی بے ڈھنگے پن کے ساتھ۔** ان بچاروں کو تو سلیقے سے محبت نامہ ہی نہیں لکھنا آتا۔ اب آپ ہی بتائیں جو محبت نامہ نہیں لکھ سکتا، اس کی تعلیم کیا آدمیت بھی نا قابلِ اعتبار ہے یا نہیں۔
سوال: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پروڈیوسر تو تھے ہی نہیں لیکن ریسیور تو ہیں؟
جواب: نہیں، ہم ڈھنگ کے ریسیور بھی نہیں ہیں ۔ تعلیمی اداروں میں بس میز کرسیاں ہیں، استادغائب ہے اور طالبِ علم بھی۔
سوال: اس تناظر میں تو مغرب پھر بہت بہتر ہوا، وہ کم از کم لکھتے پڑھتے اور تحقیق و تخلیق تو کرتے ہیں؟
جواب: مغرب ظاہر ہے اپنے تابع مہمل سے تو بہتر ہی ہوگا۔ ویسے تعلیمی تنزل وہاں بھی ہے لیکن وہاں استاد موجود اور سرمایہ کاری مضبوط ہے اور ہر علم کی ایک بڑی مارکیٹ بھی دستیاب ہے۔ وہ علم بھی پیدا کرتے جا رہے ہیں اور shrink اس کی مارکیٹ بھی۔ کرتا ان کا بھی ہوا ہے مگر فرق یہ ہے کہ ان کا قد لمبا ہے اور ہم جو ان کے شامل باجا ہیں، پیدائشی ٹھگنے ہیں۔ ان کا کرتا چھوٹا ہو کر بھی ہم مغرب پرستوں کی کرتی سے بہت بڑا ہے۔
سوال: ہمارے اس خطے میں ترقی پسندی کے انقلابیوں کا بھی ایک شہرہ رہا، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پرانے وقتوں میں روشن خیال بائیں بازو کے لوگ ہوں یا دائیں بازو کے مذہبی لوگ، سب میں دو عناصر نمایاں تھے، ایک دوسرے کے لیے ایمانداری اور احترام اور برا یا مشکل وقت آنے پر ایک دوسرے کے لیے معاون ثابت ہونا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اس سنہرے ماضی کے بارے میں کچھ بتائیے؟
جواب: بلا شبہ وہ ہمارے ماضی کی سنہری قدریں تھیں۔ یوں کہہ لیں کہ ہمارا ماضی قریب، یعنی میری نو جوانی کا زمانہ ایسا ہی تھا۔ اختلاف دشمنی نہیں بنتا تھا بلکہ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور اکرام میں مبالغے پر اکساتا تھا۔

ایوب خان کے دور میں جب بائیں بازو والے پکڑے جا رہے تھا رائیٹسٹوں کی بڑی اکثریت نے احتجاج کیا۔ اسی طرح
جب مودودی صاحب کو فوجی عدالت سے سزاے موت سنائی گئی، تو لیفٹ نے اس فیصلے کی علانیہ مخالفت کی
تھی۔ ایک مزے کی بات سناؤں، مشہور مارکسسٹ شاعر او دانشور ظہیر کاشمیری بھی اسی زمانے میں تحفظ ختم
نبوت کے ایک جلوس میں قادیانیت کے خلاف پر زور نعرے لگا رہے تھے اور پکڑے بھی گئے تھے۔ غرض اس بے مثال
سماجی روایت کے مظاہر کی ایک لمبی فہرست ہے۔ میرے دادا استاد، اور اردو کے نقاد اعظم، محمد حسن
ترقی پسند تحریک کے جان لیوا ناقد تھے لیکن اس تحریک پر سخت وقت آیا تو سب سے بلند آواز احتجاج عسکری
انہیں نے کیا۔ اسی طرح میرے استاد سلیم احمد ایک زمانے میں مشیرِ اطلاعات و نشریات مقرر کیے گئے۔ اسی زمانے
پر پابندی لگائی گئی تو انہوں نے بڑا پرغضب اختلاف کیا جس پر انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ ویسے میں جوش ملیح آبادی
یہ بات شاید آج ادب کے قارئین نہ جانتے ہوں کہ سلیم احمد، یوں کہہ لیں کہ مولانا سلیم احمد نے جوش ملیح آبادی
پر پانچ چھ مضامین کی ایک سیریز بھی لکھی تھی۔ ضیاء الحق صاحب کی صدارت میں ہونے والی ایک بڑی کانفرنس میں
بھی انہوں نے دوٹوک الفاظ میں ان لوگوں کی حمایت کی جن کے وہ ضیاء الحق ہی کی طرح شدید مخالف تھے۔

مشہور مارکسسٹ شاعر او دانشور ظہیر کاشمیری بھی اسی زمانے میں تحفظ ختم نبوت کے ایک جلوس میں قادیانیت کے خلاف پر
زور نعرے لگا رہے تھے اور پکڑے بھی گئے تھے۔

بڑے جذباتی ترقی پسند تھے۔ انہوں نے سلیم سلیم احمد ہی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ حمایت علی شاعر
احمد کے خلاف دو تین قسطوں میں بہت سخت مضمون لکھا۔ یہ مضمون آپ جانتے ہیں کہاں لکھا گیا؟ سلیم بھائی کے
گھر میں۔ وہ حیدر آباد سے آ کر سلیم بھائی کے مہمان رہے اور وہاں یہ کاروائی کرتے رہے اور روز کی روداد انہیں
سناتے بھی رہے۔ سلیم احمد کا رد عمل قہقہے سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ احمد ہمدانی بھی کٹر مارکسسٹ تھے اور
کے بہترین دوست اور عسکری صاحب کے مستعد خادم تھے۔ ایک احمد صاحب ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی سلیم احمد
میں نے سچی بات ہے کہ مارکسزم پر ان جیسا علمی تسلط اور کہیں نہیں دیکھا۔ بس اس سے اندازہ کر لیں کہ سبط
حسن، حسن ناصر اور ڈاکٹر اعزاز نظیر ایسے جنات ان کا احترام کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ عمر کے آخری حصے میں
وہ بالکل روایتی مسلمان ہو گئے تھے، جیسے کہ احمد ہمدانی ہو گئے تھے۔ تو خیر، وہ احمد صاحب سلیم بھائی کی
طرف کثرت سے آیا جایا کرتے تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ **ان کی آمد پر سلیم احمد کی آنکھیں جیسے جنت کے آسمان پر
چمکنے والے دو ستارے بن جاتی تھیں۔** ہمارے سلیم بھائی عجیب آدمی تھے، مجھ ایسے نالائق اور جاہل شاگردوں اور
برخورداروں کو بھی اختلاف پر ابھارا کرتے تھے اور نہ کریں تو ناراض ہو جاتے تھے۔ غرض میں نے اپنی آنکھوں سے
باہمی احترام و محبت کے اتنے واقعات دیکھے ہیں کہ بتانے بیٹھوں تو صبح سے شام ہو جائے۔ ہماری تہذیب میں یہ
چلن پرانا ہے۔ ڈاکٹر اشرف، ایک مشہور مارکسسٹ، دانشور اور انقلابی تھے۔ وہ مولانا حسین احمد مدنی کے قریبی
دوست تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن ان پر بہت اعتماد کیا کرتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے دیوبند آتے رہتے تھے
اور وہاں کئی کئی دن مولانا مدنی کے مہمان رہا کرتے تھے۔ اسی طرح کون نہیں جانتا کہ حبیب جالب عطا اللہ شاہ
بخاری کے کتنے منہ چڑھتے تھے۔ ڈاکٹر اعزاز نظیر انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ پارٹی کے اہم ترین لیڈروں میں سے تھے اور
مفتی محمد شفیع اور مولانا یوسف بنوری کے عاشق تھے۔ میں نے اتنا درویش آدمی کم دیکھا ہے۔

آج بیشتر لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انسانی وحدت اختلاف بلکہ نظریاتی اختلاف سے کمزور نہیں محکم ہوتی ہے۔

ممتاز حسین ٹھیٹھ ترقی پسند نقاد تھے اور ادیبوں میں ان کے برابر مارکسسٹ تھیوری کو جاننے والے جنوبی ایشیا میں
دو چار ہی ہوں گے۔ اردو کالج میں میرے استاد تھے۔ بولنے میں اچھے نہ تھے لہذا طلبہ میں مقبول نہ تھے۔ سلیم
احمد کی چاند ماری زیادہ تر انہیں پر ہوا کرتی تھی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں سلیم احمد کے حلقے کا ہوں تو ان
کے التفات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی جہالت اور بدتمیزی کی وجہ سے ان کامذاق اڑایا تو سلیم
بھائی آگ بگولہ ہو گئے اور ایسی جھاڑ پلائی کے یاد ہی تو رہے گی۔ افسوس یہ فضا ادیبوں میں بھی غارت ہو گئی ہے۔
رائٹ لیفٹ کے علاوہ اسلام کے رائٹ لیفٹ یعنی سنی شیعہ میں جو معاشرتی ہم آہنگی تھی وہ بھی قصہ ماضی ہوئی۔
اور جانے کیا کیا سمجھتا ہوں اور اس پر واضح Anthropomorphismبے تکلفی سے کہوں تو میں شیعیت کو دیومالا،
اور دو ٹوک موقف رکھتا ہوں مگر میرے محسنوں اور دوستوں میں کتنے ہی شیعہ شامل ہیں جو خود تسنن کے جی
بھی کے مخالف ہیں اور اپنے مذہب پر میرے اعتراضات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اسی طرح مارکسزم اور اکثر
مارکسسٹوں کی کٹھ ملائی پر میری تند و تلخ باتیں سنتے رہتے کے باوجود بہت سے ہارڈ کور مارکسسٹ میرے حلقہ
احباب میں رہے ہیں۔ آج بیشتر لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انسانی وحدت اختلاف بلکہ نظریاتی اختلاف سے
کمزور نہیں محکم ہوتی ہے۔

سوال: پاکستا ن کے معروف اشتراکی دانشور اقبال احمد، جن کی ایک عالمی شہرت ہے، ان کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟
انہیں اشتراکی کہنا شاید درست نہ ہو۔ وہ ایسے ہی اشتراکی تھے جیسے عبید اللہ سندھی تھے، مولانا حسرت موہانی تھے۔ اقبال احمد بلا شبہ ایک بین الاقوامی شخصیت تھے۔ جیسے ڈاکٹر فضل الرحمن تھے۔ بین الاقوامیت کو ایک آئیڈیا فرض کیا جائے تو وہ آئیڈیا ان کی ذات، ان کی فکر اور ان کے طرزِ احساس میں مجسم ہو گیا تھا۔ اپنے ہیومنزم کی وجہ سے لیفٹ کی طرف جھکاؤ ضرور رکھتے تھے مگر لیفٹسٹ نہیں تھے۔ سارتر، فرانز فینن وغیرہ کی طرح **وہ مارکس کے ورلڈ ویو اور غیر طبقاتی عالمی سماج کے آئیڈیل کی طرف مائل یقیناً تھے لیکن پرولتاریا راج اور سماج کا تصور نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی کمیونزم سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔ وہ ایسے انسان دوست تھے جو انسان کو تقسیم کرنے والے نظریات اور پالیسیوں کو نفرت کے جذبے سے لیکن ایک ایسی تاریخی، تہذیبی اور سیاسی بصیرت کے ساتھ رد کرتے تھے جو ہمارے خطے کے لیفٹسٹ یا رائیٹسٹ دونوں طرح کے دانشوروں میں کم ہی نظر آتی ہے۔** کیپٹلزم کو جتنا وہ سمجھتے تھے، اتنا شاید ہی کوئی سمجھتا ہو۔ وہ ظلم سے عملاً بھی لڑے اور ایسی ایسی قربانیاں پورے وقار اور انکسار کے ساتھ دیں جنھیں سوچ کر بھی اچھے اچھے انقلابیوں کی گھگھی بندھ جائے۔ استعمار اور سامراج سے جتنی نفرت وہ کرتے تھے اور ان کی چالوں کو جتنا وہ سمجھتے تھے، اتنی نفرت تو شاید ہمارے کچھ انقلابیوں اور مجاہدوں میں پائی جاتی ہو مگر وہ فراست اور بصیرت کم از کم تیسری دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ **وہ صوفیانہ تعبیر کے ساتھ اسلام سے متعلق رہے اور اکثر لیفٹسٹوں کی طرح مذہب کا مذاق اڑانے کے جاہلانہ خبط میں مبتلا نہ تھے۔** امریکی اسٹیبلشمنٹ خاص طور پر ان سے ڈرتی تھے جس طرح ذوالفقار علی بھٹو سے ڈرتی تھی۔ یہ ڈر کسی خود کش جیکٹ کا نہیں تھا، ان کے براق ذہن اور سفاک قلم کا تھا۔ سیاست، معیشت، خارجہ امور وغیرہ کے علاوہ وہ جدید فلسفے اور لٹریری اور لسانیاتی تھیوری وغیرہ میں بھی خاصا درک رکھتے تھے۔ بر صغیر کی مسلم تہذیب کا جو بننے دی جاتی تو اس کے ثمرات رچاؤ ان کی شخصیت میں تھا، وہ بھی دیکھنے کی چیز تھا۔ اگر خلدونیہ یونیورسٹی علی گڑھ یونیورسٹی سے کہیں زیادہ مثبت، گہرے، دور رس اور کثیر الجہات ہوتے۔
مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پوسٹ کولونیل تیسری دنیا میں سرمایہ دارانہ نو استعماریت کے سامنے کھڑی ہونے والی سب سے بڑی دو چار شخصیتوں میں ایک اقبال احمد تھے۔ آخر کوئی وجہ تو ہو گی کہ نوم چومسکی اور ایڈورڈ سعید ایسے لوگ ان کے مداح تھے اور بعض باتوں میں ان سے متاثر بھی تھے۔ اقبال احمد ایسی انگریزی نثر ہم دیسیوں میں کتنوں نے لکھی ہے، ڈاکٹر فضل الرحمن کو چھوڑ کر شاید کسی ایک نے بھی نہیں۔ ہماری صحافت کی تاریخ میں انگریزی کالم نگاری میں مولانا محمد علی جوہر کو چھوڑ دیں تو کوئی ان کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔ بس مجھے ان کی ایک بات عجیب لگی کہ اقبال پر فیض کو ترجیح دیتے تھے۔ ارے ہاں، یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ فوکو اور فینن کی طرح وہ تھوڑے سے انارکسٹ بھی تھے۔ اڈورنو کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور یہ اچھا تھا کیونکہ مغربی سرمایہ دارانہ امپیریلزم کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت سا مارکسزم اور تھوڑا سا انارکزم ضروری ہے۔

سوال: اقبال احمد پر یہ باتیں سن کر ایک ذرا ذاتی سا سوال ذہن میں آرہا ہے۔ آپ کو کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں؟ اور آج کل ادیبوں میں آپ کی پسندیدہ شخصیت کون سی ہے؟
جواب: آسانی کے لیے تین کیٹیگریز بنا لیتے ہیں۔ دلچسپ لوگ، پسندیدہ لوگ اور محبوب لوگ۔ مجھے ان لوگوں میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے، میرا مطلب تجسس نہیں بس دلچسپی ہے جس کی کیفیت تفریحی اور نشاطیہ ہوتی ہے، تو مجھے ایسے لوگ دلچسپ لگتے ہیں جو ذرا سے کھسکے ہوئے ہوں۔ ایک زمانے میں پاگلوں میں بیٹھ کر انہیں احساسِ کمتری کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ ان کی باتیں اتنے ہی غور سے سنا کرتا تھا جتنا دماغ پر زور دے کر آج کل ایڈمنڈ ہسرل کو پڑھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا اور تھوڑا بہت اب بھی ہے کہ دیوانگی شعور کی مجذوبی ہے، بلکہ زیادہ ٹھیک سے کہوں تو عارفانہ مجذوبی ہے۔ اس میں بس معلوم رہ جاتا ہے ادراک اور اظہار کی مروجہ صورتوں سے ماورائی کی حالت میں، علم اور سبجیکٹ یعنی عالم کی ملاوٹ زائل ہو جاتی ہے۔ نوجوانی میں سنجیدگی سے چاہتا تھا کہ دیوانگی کا کوئی تجربہ راں ہو کی طرح مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے کر کچھ دن بعد آزاد کر دے۔ میرا اندازہ ہے کہ نوجوانی کی اس خواہش نے خاصا ذہنی اور اخلاقی فائدہ پہنچایا۔ آنکھ بند کرنا دیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ کرنے لگا اور تنہائی جیسے خود سے بھی خالی لگنے لگی۔ لیکن جناب، یہ سب نفسی احوال تھے، ان کا روحانیت سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ دیوانوں کے علاوہ مجھے ان لوگوں میں ایک ذرا مختلف سی دلچسپی محسوس ہوتی ہے جو خود کو وہ پوز کرتے ہیں جو ہوتے نہیں ہیں۔ پھر **اپنے بارے میں اپنی بساط سے بڑھ کر بڑے بڑے دعوے کرنے والے لوگ بھی مجھے**

دلچسپ لگتے ہیں۔ جیسے ایك سینیر دوست تھے جو فلسفے میں پی ایچ ڈی تھے مگر فلسفہ بس واجبی سا جانتے تھے۔ وہ ایك کتاب لکھنا چاہتے تھے جس میں طالیس اور فیثاغورث سے لے کر دریدا تك کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ چھوڑا جاتا۔ وہ مجھے اپنا واحد مرتبہ شناس سمجھتے تھے۔ جو لکھنا چاہتے پہلے مجھے سناتے تھے۔ میں جب تك انہیں یہ یقین نہ دلا دیتا کہ آپ نے افلاطون کے پرزے اڑا دیے، ہیوم کو دو ٹکے کا بنا دیا، کانٹ کی ایسی تیسی کر دی، ان کی تسلی نہ ہوتی۔

دوسری کیٹیگری کو لیں تو **مجھے دوستی کے روایتی بلکہ داستانی تصور پر چلنے والے لوگ بہت پسند ہیں۔ جذباتی لوگ بھی پسند ہیں بشرطیکہ وہ خود پسند نہ ہوں** اور انصاف پسندی کا مزاج رکھتے ہوں۔ بھولے لوگ تو بہت ہی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اپنی کمتری کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایثار کیش، منکسر المزاج، اپنی خوبی چھپانے والے، نرم دل لوگ بھی دل سے پسند ہیں۔ وہ لوگ بھی اچھے لگتے ہیں جو ہوتے تو سادہ لوح ہیں مگر زیرك اور چالاك بنتے ہیں۔ اب رہ گئی محبت کی بات، تو مجھے وہ صاحب غیر مشروط طور پر محبوب ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں مجھے گمانِ غالب ہو جائے کہ یہ اللہ کے محبوب ہیں، یعنی ان کی شخصیت رسول اکرمﷺ کے مزاجِ اقدس میں ڈھلی ہوئی ہے۔

سوال : مجھے یہ تو معلوم ہے کہ ادیبوں شاعروں میں آپ شخصیت کے اعتبار سے سلیم احمد، محب عارفی اور رئیس فروغ کو دل سے سراہتے ہیں۔ آج کل کے کس ادیب کی شخصیت کو آپ اسی طرح پسند کرتے ہیں؟

جواب : محمد سلیم الرحمٰن اور خورشید رضوی کو۔ سلیم الرحمن صاحب آج کے سب سے بڑے نظم گو ہیں، سب سے بڑے مترجم ہیں اور میرے خیال میں ادیبوں ہی میں نہیں، صوفیوں اور عالموں میں بھی رکھ کر دیکھا جائے تو بھی ان کی شخصیت بہت ہی بڑی ہے۔ خورشید رضوی صاحب بہت عمدہ غزل گو، تخلیقی محقق ہیں، عربی فارسی کے منتہی ہیں، خصوصاً عربی دانی میں۔ اور عربی شاعری اور تہذیب کا جیسا ہمہ جہت فہم اور ذوق یہ رکھتے ہیں، آج کے عربی دانوں میں شاید کوئی صاحب بھی ان کی برابری نہیں کرتے، زباں دانی کا جیسا ملکہ یہ رکھتے ہیں وہ ہمارے زمانے میں بہت ہی کمیاب ہے۔ اور ان علمی اور تخلیقی اوصاف کے ساتھ ان کی شخصیت میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو بڑی شخصیتوں کے لیے بھی موجبِ فخر ہوا کرتی ہیں۔ مجھے دنیا سے اور اپنے آپ سے بے نیاز لوگ بہت اچھے بلکہ بہت بڑے لگتے ہیں۔ **سلیم صاحب ایسے ہی ہیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ دوسری تیسری صدی کا کوئی راہب ڈھائی ہزار برس کی ریاضت مکمل کر کے ہمارے شہر میں آ بسا ہے۔** میں ان سے دو ایک بار ہی ملا ہوں مگر سچ پوچھیے تو ان سرسری سی ملاقاتوں کا یہ اثر ہوا کہ ان کا خیال بھی آجائے تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر ایک بہت ہی بامعنی اٹھان کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ یہ الگ بات کہ اپنی نالائقی کی وجہ سے تھوڑی دیر بعد اس اونچائی سے گر جاتا ہوں۔ غرض آپ شخصیت میں بڑائی کی جو حالتیں ہوتی ہیں، ان کی فہرست بنا کر کچھ دن کے لیے سلیم الرحمن صاحب کی مصاحبت میں رہیں۔ اس فہرست میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جائے گا۔

اور خورشید رضوی صاحب بھی ایسے ہی ہیں۔ بے نیاز مگر حد درجہ ذمہ دار، ادراک بھی گہرا اظہار پر بھی قادر، جلوت سے نہ بھاگنے کے باوجود خلوت پسند، شدید بے غرض مگر غرض مندوں کے لیے حاضر، تھوڑی سی قنوطیت کے باوجود لوگوں کی آس بندھانے والے، اور مثالی بیٹے، فرزند ایسے شاگرد، باپ ایسے استاد، استاد ایسے باپ، جتائے بغیر ایثار کرنے والے محبتی شوہر، اور اظہارِ محبت کو غیر ضروری سمجھنے والے دوست۔ مجھے ان کی جس صفت نے ان کی طرف لپکنے پر مجبور کیا وہ یہ ہے کہ اپنے استادوں اور بڑوں پر فدا ہیں اور ان کے ذکر کا موقع مل جائے تو دنیا جہان سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ **اپنے بڑوں کے لیے ان کے اندر ایک امیر خسرو چھپا ہوا ہے۔** اس کے علاوہ اپنی والدہ سے ان کی محبت ان کی زندگی میں دیکھنے والوں کو بالکل مجذوبوں سی محسوس ہوتی تھی۔ اور اب ان کی رحلت کے بعد سالکوں سی ہو گئی ہے۔ اللہ دونوں کو صحت و عافیت اور اطمینان و راحت کے ساتھ سلامت با کرامت رکھے۔

سوال : آسمانی اور مذہبی کتابوں کے بعد وہ ایک کتاب کون سی ہے جسے آپ ہمیشہ ساتھ رکھنا چاہیں گے؟

جواب : رومی کا دیوان، یعنی "دیوانِ شمس"۔

سوال: آپ اب بھی شاعری کرتے ہیں؟ اور آپ کی ایك کتاب 'آندھی کا رجز' تو شائع بھی ہو چکی ہے۔

جی ہاں ٹوٹی پھوٹی کرتا رہتا ہوں۔ دوسری کتاب جلد آنے والی ہے۔

سوال: آخری سوال، آپ اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں، مگر یہاں اس مکالمے کے قارئین کے لیے اختصار کے ساتھ بتانا چاہیں کہ میر یا غالب میں سے کون بڑا شاعر ہے تو میں اس شفقت کے لیے آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

جواب : **میر۔ غالب لفظ پر ایک پیچیدہ سا تصرف ضرور رکھتے ہیں مگر اس میں زور زبردستی سے بھی کام لیتے ہیں۔ اپنے مطلوبہ معنی اگلوانے کے لیے وہ بعض اوقات اس کا گلا بھی گھونٹ دیتے ہیں۔** اسی لیے افتخار جالب کی اصطلاح میں ان لسانی تشکیلات روایت کا حصہ نہ بن سکیں اور دیوانِ غالب سے باہر نہ نکل سکیں۔ اس کا سبب یہ ہے

کہ کہیں کہیں ان کی کھینچا تانی لفظوں کی لسانیت اور معنویت کو اتنا مصنوعی بنا دیتی ہے کہ وہ ایک تو زبان یا کہہ لیں کہ سمجھ آنے والی زبان کے بیسک یونٹس نہیں معلوم ہوتے اور دوسرے یہ کہ حد سے بڑھی ہوئی غرابت انھیں معنی کی تشکیل کے اس عمل میں اجنبی بلکہ بعض جگہوں پر مہمل بنا دیتی ہے جو قاری کے ذہن میں وجود پکڑتا ہے۔ وہ الفاظ کو ناراض بھی کر دیتے تھے۔ ہاں، غالب کا تخیل اتنا بے مثل ہے کہ اس کے مقابلے میں میر کے تخیل کو برتری دینا ممکن نہیں۔ تاہم میر کا تخیل مختلف نوعیت کا ہے۔ وہ غالب کی طرح کا فکری اور ذہنی تخیل نہیں بلکہ احساس کی قبیل سے ہے۔ اسی لیے امیجری میں غالب کا پلہ قدرے بھاری ہے، یعنی وہ مصور اچھے ہیں۔ غالب آنکھ کو میر سے زیادہ شاداب رکھتے ہیں۔
میر اور غالب کے تخیل کا فرق شمس الرحمن فاروقی نے بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے کہیں لکھا ہے، غالباً " شعرِ شور انگیز کے مقدمے میں، کہ غالب کا تخیل آسمانی ہے اور میر کا زمینی۔ لیکن غالب کی اس جزوی برتری کے باوجود مجموعی طور پر میر اس لیے ان سے بڑے بلکہ بہت بڑے شاعر ہیں کہ وہ لفظ کی ساخت اور سماعی اور وضعی معنی میں کوئی توڑ پھوڑ کیے بغیر، لفظ کے ساتھ زور زبردستی کیے بغیر اس کی معنویت میں طرح طرح کے اضافے کر دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ خیال سے زیادہ احساس کے شاعر ہیں۔ وہ احساسات میں اتنی تہہ داری پیدا کر دیتے ہیں کہ محسوس کی شعوری حیثیت مفہوم اور معلوم سے بڑھ جاتی ہے، یعنی احساسات اور کیفیات، خیالات اور بھی غالب کے فکری و cognitive value تصورات سے زیادہ بامعنی وسیع الاطراف ہو جاتے ہیں۔ میر کے تجربے کی ذہنی تخیل کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو میر پر محب عارفی صاحب کی جو کتاب ہے، وہ پڑھنی چاہیے۔ زبان اور احساسات پر میر کو جو قدرت اور رسوخ حاصل ہے وہ اردو تو کیا فارسی کے عظیم شعرا میں بھی کمیاب ہے۔ غالب لفظ کے ساتھ غیریت کا تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کی امیجری اور مضامین میں ایک پر شکوہ باہری پن زیادہ ہے، جبکہ میر لفظ کے ساتھ عینیت کے نئے نئے زاویے ڈھونڈ نکالتے ہیں، اس لیے ان کی امیجری اور مضامین میں گہرائی اور اندرونی پن غالب ہے۔ اس لیے ان کے یہاں توسیع پذیری کا عنصر غالب سے زیادہ ہے اور تضادات کی تالیف کا نادر وصف بھی میر کے یہاں ایسا ہے کہ اس کی بہت کمتر مثالیں بھی اردو شعری روایت میں نہ **ہی نہیں کرتے۔ وہ تو حروف جار exist** ہونے کے برابر ہیں۔ اور **زبان پر قدرت کے معاملے میں تو غالب میر کے آگے اور افعال کو اسمائی معنویت دے دیتے ہیں۔**